نگار
پاکستان



رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۴۷۲ جاری شدہ ۱۹۲۲ء
تعلیمی اداروں کیلئے محکمہ تعلیم کراچی سے منظور شدہ سرکلر نمبر ڈی ٹی / ایف بی ۳۲۹

بانی
علامہ نیاز فتح پوری

نگار پاکستان

مدیر
ڈاکٹر فرمان فتح پوری

معاونین
کامل القادری ——— ریاض صدیقی
امراؤ طارق ——— فردوس حیدر

دفتر
۲۴/۶۰ ورلی روڈ - گارڈن ایسٹ - کراچی ۳
مراسلت - سی - ۲۸ - بلاک ۱۳ - ڈی گلشن اقبال کراچی
فون: ۴۱۹۹۶۸

زیر نظر شمارہ مکتبہ خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی ۵ روپیہ
اختر نشین نے ایجوکیشنل پریس سے چھپوا کر ۱۵۹ - اے قمر کتاب گھر اردو بازار سے شائع کیا

فہرست مضامین

۵۹ واں سال	۱۹۸۰ء	شمارہ ۳-۴

ملاحظات

بھارت میں ایک مہینے تین دن

(۲)

اس عنوان سے جنوری، فروری کے پرچے میں بھارت کے سفر کا اجمالی خاکہ پہلی قسط کے طور پر دیا جاچکا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل، بہت سی خوشگوار یادوں اور ناقابلِ فراموش تجربوں سے وابستہ ہے۔ ہر چند کہ اب یہ تفصیل پوری جزئیات کے ساتھ ذہن میں نہیں۔ وقت اور حافظے میں اللہ واسطے کا بیر ہے۔ جیسے جیسے وقت سے دُور ہوتے جائیے، حقائق کی دُنیا خواب بنتی چلی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد کو یہی خواب، کبھی ادب کے نام پر کبھی فکروفن کے نام پر اور کبھی تاریخ و تہذیب کے نام پر ایک بار پھر، حقیقتوں کا رُوپ دھار لیتے ہیں اور وقت، اُن کا منہ تکتا رہ جاتا ہے۔ اس لئے حافظے میں محفوظ خیالات، اگر حقائق سے دُور بھی جا پڑیں، اور یادوں کی دنیا ذرا سی کہر آلود ہوجائے تو بھی محبت اور پیار کے حوالے سے، اِس کی خنک فضا، زندگی کے حق میں، طرب انگیز ہی رہتی ہے اور یہی جی چاہتا ہے کہ لغزشِ خیال کا خوف کئے بغیر، حافظے میں جو کچھ موجود ہے، اُس کی بازیابی کی لذّت سے محروم نہ رہا جائے۔

دہلی کی پہلی شام | زندگی کی کتنی بڑی محرومی تھی کہ
"دلّی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب"

میری آنکھیں اس کی دید سے اب تک محروم تھیں، یوں تو ہزاروں خواہشیں ایسی ہیں کہ ہر خواہش پہ دم نکلے، لیکن اپنے ادب، اپنی ثقافت، اپنی تہذیب اور اپنی تاریخ کے

حوالے سے دلّی دیکھنے کی خواہش کچھ اور ہی چیز تھی، عجیب طرح کا اشتیاق، اور عجیب طرح کی آرزو مندی تھی، چند روز پہلے تک بظاہر دلّی جانے کا نہ کوئی موقع تھا نہ ارادہ، لیکن اب کے

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا!
دل کچھ اس صورت سے تڑپا اُس کو پیار آ ہی گیا۔

۹ نومبر کو شام کی فلائٹ سے تقریباً ۸½ بجے دہلی پہنچ گیا۔ روانگی سے چند گھنٹے پہلے، دہلی سے فون پر رابطہ قائم ہو گیا تھا، اس لئے پالم ایرپورٹ پر میں اکیلا اور اجنبی نہ رہا۔ جہاز سے اُترتے ہی لاؤنج کی اوپر والی گیلری میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نظر آ گئے۔ اُن کا گھر ایرپورٹ سے خاصے فاصلے پر ہے اور دہلی کے مشہور محلہ دریا گنج، جامن والی گلی میں "کلاں محل" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی یُوں محسوس ہوا جیسے میں اپنے خاندان، اور قریب ترین عزیزوں کے حلقے میں آ گیا ہوں۔ موہنی (بیگم انجم)، آپا (انجم کی بڑی بہن) صفیہ و عذرا (چھوٹی بہنیں) بھائی سعید، برادرم ڈاکٹر اسلم پرویز، ننھے منّے ثمر اور سیما، سبھی سب میرے انتظار میں تھے۔ ہر ایک نے والہانہ انداز میں مجھے خوش آمدید کہا، اور ذرا سی دیر میں، سب مجھ سے اس طرح گھل مل گئے کہ چند لمحوں کے لئے بھی مجھے اجنبیت کا احساس نہ ہوا۔ میز کرسیاں، سب اپنی جگہ رکھی رہ گئیں، دسترخوان لگا اور سب نے بریانی اور زردے پر ہاتھ صاف کیا۔ کھانا حد درجہ لذیذ اور خوش ذائقہ بھی تھا اور جمال افروز و نظر گیر بھی تھا۔ پوچھنا پڑا کس نے پکایا ہے، پہلے سب ایک دوسرے کو دیکھ کر مُسکرائے، پھر انجم صاحب بولے "ڈاکٹر اسلم صاحب. صرف ادب کے ڈاکٹر نہیں ہیں۔ انشاءاللہ خاں انشاء پر جو انہوں نے اعلیٰ درجہ کی کتاب لکھی ہے وہ محض انشاء کے فکر و فن سے دلچسپی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ انشاء کی زندگی و شخصیت سے بھی بہت متاثر ہیں حتیٰ کہ انشاء ہی کی طرح، اسلم بھی ہر فن مولا ہیں، بہت سے علوم و فنون پر دسترس ہے اور اسی دسترس کا حاصل، آج کا کھانا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کھانے کی تیاری میں ساری محنت اور سارا وقت موہنی انجم کا صرف ہوا تھا، ہدایت کار البتہ اسلم صاحب تھے۔ کھانے کے بعد موہنی انجم کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی گرین چائے آئی اور جگر مرادآبادی کے لفظوں میں معمولی ترمیم کے ساتھ اس کی صورت یہ ہوئی کہ:

آئی جوان کی "چائے" تو آئی چلی گئی ہر نقش ماسوا کو مٹاتی چلی گئی !

باتیں ہوتی رہیں، قہقہے لگتے تھے، اور وقت، دبے پاؤں آگے بڑھتا رہا۔ اچانک کسی نے گھڑی دیکھی، معلوم ہوا دو بجے ہیں، صبح سویرے سبھی کو اپنے اپنے کاموں پہ جانا تھا۔ چاروناچار، شب بخیر، کہہ کر، محفل برخاست کرنی پڑی۔

ایک مدت سے میرا معمول یہ ہے کہ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک سو گیا، صبح تڑکے غسل کر کے، کچھ کھائے پیئے بغیر، کام کرنے بیٹھ گیا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد چائے کے ساتھ ناشتہ مل گیا، پھر کام کرنے لگا، ساڑھے آٹھ کے قریب کپڑے بدلے، یونیورسٹی چلا گیا، لیکن سفر میں یا کسی جگہ عارضی قیام میں، اگر ان معمولات میں فرق پڑ جائے تو کسی قسم کی الجھن یا تکلیف نہیں ہوتی۔ البتہ دو بجے رات تک جاگنے کے بعد نیند نہیں آتی، دم سادھے آرام سے لیٹا رہتا ہوں۔ اس بات کا ذکر اس جگہ یوں ضروری تھا کہ میں ابھی جاگ ہی رہا تھا کہ، بہت تڑکے، اپنے معمول کے مطابق، مومنی انجم نے آواز لگائی "انجم صاحب، اٹھیے، چائے آگئی"۔ معلوم ہوا، میاں بیوی دونوں مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح صبوحی کے عادی ہیں، غسل و ناشتہ سے پہلے کئی دور ہو چکتے ہیں، تب اُن کی جان میں جان آتی ہے۔ پہلے روز، میں اُن کے اس شغل میں تکلفاً شریک ہوا، پھر شوق سے پینے لگا۔ اب یہ صورت ہے کہ صبح کی چائے کے بغیر، بستر سے اُٹھنا مشکل ہوتا ہے۔ دہلی میں انجم کے گھر کا جامِ صبح گاہی، میرے لئے رحمت اور میری بیگم کے لئے نئی زحمت ہے۔ لیکن رحمت اور زحمت میں فرق ہی کتنا ہے؟ صرف ایک نقطے کا اور اقلیدس کی رُو سے نقطے کا فاصلے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لئے گھر کی فضا کے لئے اس سے نہ کوئی خطرہ ہے نہ اس جگہ اس پر بحث کی ضرورت۔

ایوانِ غالب اور غالب سیمینار

۹ر نومبر کی رات کو دہلی پہنچا تھا، صبح ۱۰ر نومبر کو ۱۱ر بجے، "غالب اور عہدِ غالب" کے موضوع پر "ایوانِ غالب" میں سیمینار تھا، چنانچہ ڈاکٹر خلیق انجم کے ساتھ "اردو گھر" (انجمن ترقی اردو ہند کا عالی شان دفتر جس کا مفصل تذکرہ آئندہ کسی قسط میں ہوگا) ہوتا ہوا، ایوانِ غالب پہنچا۔ "ایوانِ غالب" ایک مستقل

ادارہ ہے جو غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر، لاکھوں روپے کی لاگت سے وجود میں آیا ہے۔ "غالب مارگ" پر اس کی شاندار، کشادہ عمارت، علاقے کی رونق میں اضافہ کرتی ہے، اور دیکھنے کے لائق ہے۔ یہ دو بڑے حصوں میں تقسیم ہے، ایک حصے میں [illegible] نشستوں کا آڈیٹوریم، دوسرے میں "ایوانِ غالب" کا انتظامیہ دفتر، ایک اچھا کتب خانہ، غالب سے متعلق نوادرات سے آراستہ ایک میوزیم، اس سے ملحق، مہمانوں اور نوواردوں کے لئے ڈرائنگ روم، اور تصانیف غالب کی اوّلین اشاعتوں کے سرورق اور دوسری نادر تصویروں سے مزین گیلری ہے، باہر کشادہ لان، اور پارکنگ کے لئے مناسب جگہ ہے۔ غرض کہ "ایوانِ غالب" غالب کے سلسلے کا ایک اہم اور قابلِ دید، یادگار ہے۔ اور پاکستان کے علمی و ادبی حلقوں کے لئے ہر لحاظ سے قابلِ رشک۔

میں ایوانِ غالب کے آڈیٹوریم میں، کوئی ۱۱½ بجے داخل ہوا، یہ افتتاحی اجلاس تھا اور شروع ہو چکا تھا۔ اسٹیج پر ڈاکٹر امیر حسن عابدی، ڈاکٹر نذیر احمد اور پروفیسر اسلوب احمد انصاری موجود تھے، خطبۂ استقبالیہ اور تعارفی تقریروں کے بعد، اجلاس کے صدر، پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے، غالب سیمینار اور غالب، دونوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی، تحریر کی طرح، اُن کی تقریروں میں بھی تفکر، استدلال اور تجزیے کا خوبصورت امتزاج ہوتا ہے۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے اُستاد ہیں۔ عام طور پر اُردو ہی میں لکھتے ہیں۔ اور عہدِ حاضر کے معتبر ناقدوں میں اُن کا شمار ہے۔ غالب اور اقبال کے سلسلے میں اُن کی تنقیدی تصانیف "نقشِ غالب" اور "اقبال کی تیرہ نظمیں" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ آخر الذکر، کتاب، پاکستان میں بھی چھپ چکی ہے۔ "نقشِ غالب" غالب صدی کے موقع پر "غالب اکیڈمی" نئی دہلی نے شائع کی ہے۔ "غالب اکیڈمی" جس کے ناظم ذہین نقوی صاحب ہیں، بوجوہ "ایوانِ غالب" سے بھی زیادہ، شاندار اور افادی ادارہ ہے لیکن اس کا مفصل ذکر کہیں کسی اگلی

قسط میں آئے گا۔

غالب سیمینار کے افتتاحی اجلاس کے خاتمے پر، چائے کے وقفے میں، اُن لوگوں سے تعارف و ملاقات کی صورت پیدا ہوئی، جن سے ملنے، بات کرنے اور جن کے دیکھنے کے لئے آنکھیں ترستیاں تھیں، پاکستانی ادیبوں میں، میرے علاوہ، ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی اور شان الحق حقی صاحب بھی اس سیمینار میں شریک تھے۔ ان دونوں کے لئے، دلی اور اہلِ دلی، نئے نہ تھے، البتہ میں دلی میں نووارد تھا۔ اس سیمینار میں شریک ہندوستانی ادیبوں میں، بیشتر سے میری ملاقات تھی۔ اس لئے بڑی گرم جوشی کے ساتھ بغل گیر ہوئے۔ بعض ہم عمر ادیبوں اور قلمی دوستوں سے کچھ اس طرح سے موانقہ ہوا جیسے، جانی دشمن، ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں بقول سعدی۔

چناں با دوست آمیزم بدل گرمی و جاں سوزی
کہ در ہنگامِ جاں بازی بلد دشمن، دشمن آمیزد

پروفیسر اُسلوب احمد انصاری صاحب، عمر و سال، علم و فضل اور شہرت و منصب، ہر طرح مجھ سے بڑے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد اُن بزرگ اور سن رسیدہ عالموں اور محققوں میں ہیں جن کی مثالیں، اب پاک و ہند میں، ایک آدھ سے زیادہ نہیں۔ مالک رام صاحب تحقیق و تنقید کے حوالے سے غالب کے اُن بیارکھوں میں ہیں جن کے فیصلے، ادبی عدالتوں میں بطور اسناد و امثال پیش کئے جاتے ہیں۔ اِن بزرگوں کے سامنے، کیا میں اور کیا میری بساط، لیکن اِن میں سے ہر شخص، اتنی محبت اتنی شفقت، اتنے انکسار اور ایسی خوش خلقی کے ساتھ ملا جیسے میں بڑا، وہ چھوٹے ہیں۔ اللہ اللہ بڑوں میں عظمت کی کیسی کیسی نشانیاں ہوتی ہیں۔ اِن سے مل کر سمجھ میں آیا، کہ بزرگوں نے یونہی نہیں کہا کہ:

فروتنی ست دلیلِ رسیدگانِ کمال   کہ چوں سوار بہ منزل رسد پیادہ شود

"غالب اور عہدِ غالب" کے سیمینار کے لئے دو دن رکھے گئے تھے، لیکن

خواجہ حسن نظامی کی پچیسویں برسی کی تقریبات (ان تقریبات کا ذکر بھی کسی اگلی قسط میں آئے گا) کے سبب ڈیڑھ دن میں سمیٹ دیا گیا۔ ڈاکٹر اقتدار حسین صدیقی، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، رشید حسن خاں، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، حسن نعیم، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر سید محمد حسنین، ڈاکٹر نذیر احمد نے غالب کی زندگی اور فن پر اظہار خیال کیا۔ بیشتر نے تحریری اور بعض نے نے زبانی۔ سیمنار میں شریک پاکستانی ادیبوں نے تقریریں کیں اور انہیں بعض اجلاسوں کی صدارت کا اعزاز بھی بخشا گیا۔

بلاشبہ یہ ایک کامیاب سیمنار تھا، مقالات کا معیار اور علماء و ادبا کا اجتماع، ہر اعتبار سے، غالب کی شخصیت کے شایانِ شان تھا۔ ہر مقالہ، اور ہر تقریر، سنجیدگی سے سُنی گئی۔ سوال و جواب کے وقفوں میں سامعین و مقررین کے درمیان دلچسپ اور فکر انگیز نوک جھوک بھی رہی۔ ہر چند کہ غالب سے متعلق اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ کوئی نئی بات کہنا مشکل ہے۔ پھر بھی بعض مقالہ نگاروں خصوصاً حسن نعیم، ڈاکٹر حامدی کاشمیری، رشید حسن خاں، اور ڈاکٹر نذیر احمد نے غالب کی زندگی و فن کے بارے میں بعض ایسے سوالات اٹھائے اور بعض ایسے گوشوں کا احساس دلایا، جو آج بھی تشنۂ تشریح و توجیہہ ہیں۔ (باقی) فرمان فتح پوری

اپریل کا مہینہ، اُردو کے عظیم مفکر شاعر، علامہ اقبال اور اُن کے ایک پرستار و نامور مؤرخ ڈاکٹر محمود حسین کے وصال کا مہینہ ہے، دونوں کے یادوں کے چراغ، اس پرچے میں روشن ہیں لیکن اسی مہینے، پروفیسر ڈاکٹر خان رشید اور سرور بارہ بنکوی کی اچانک حالیہ رحلت نے پلکوں پر جو ستارے روشن کر دیئے، انھیں کہاں لے جائیں، وہ تو ابھی اسی طرح تا دیر روشن رہیں گے۔ (ادارہ)

ڈاکٹر محمود حسین

مسلمانوں کی سیاسی بیداری میں اقبال کا حصّہ

حضرات! اقبال کی شخصیت ان شخصیتوں میں سے ایک ہے جو کبھی کبھار ہی دُنیا کے اسٹیج پر رُونما ہوا کرتی ہیں۔ اقبال نے اپنے نہ مٹنے والے نقوش ہمارے شعروادب ہی پر نہیں چھوڑے، موجودہ قومی زندگی کے کسی پہلو پر نظر ڈالیے، چاہے وہ سیاسی ہو یا معاشرتی، مذہبی ہو یا علمی اقبال کا اثر صاف نظر آئے گا۔ اقبال سے مسلمانوں کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے جسے بجا طور پر "دورِ اقبال" کہا جا سکتا ہے۔ اقبال پر کچھ لکھنا یا کہنا بڑا مشکل کام ہے۔ میں اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کے صرف ایک پہلو پر کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں گا اور وہ پہلو ہے:

"مسلمانوں کی سیاسی بیداری میں اقبال کا حصہ"۔

یوں تو اس برصغیر میں مسلمانوں کا سیاسی زوال اٹھارویں صدی میں شروع ہو چکا تھا مگر ۱۸۵۷ء کی ناکامی نے اس پر مہر ثبت کر دی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد غیر ملکی فاتحین نے جوشِ انتقام میں ہر وہ ظلم روا رکھا جس کا تصور کیا جا سکتا ہو۔ مسلمانانِ ہند جو اپنی حکومت کے ختم ہو جانے اور اپنے اقتدار کے چھن جانے پر مایوس ہو رہے تھے، اس بے پناہ ظلم سے اور بھی سراسیمہ اور بدحواس ہو گئے اور باوجود اس کے کہ اس انقلاب نے اُن کی معاشی زندگی پر بھی کاری ضرب لگائی تھی، انھوں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ ہر معاملہ سے بے تعلق ہو جائیں۔ اگر یہ صورتِ حال زیادہ عرصہ باقی رہتی تو ممکن تھا کہ اندلس کی طرح ہندوستان سے بھی مسلمانوں کا وجود مٹ جاتا۔ یہ عالم تھا کہ سر سید سامنے آئے۔ سر سید نے ایک طرف تو مسلمانوں کو ہندوستان کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی میں اپنا جائز حق حاصل کرنے کے گر سکھائے اور دوسری طرف حاکموں کے جذبۂ انتقام کو فرو کرنے اور ان کے غیض و غضب سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیں۔

میرے خیال میں سر سید کی تحریک شاید خود سر سید کی نگاہ میں دوسری تحریکوں کیلئے ایک

پیش خیمہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ مقصود بالذات نہ تھی۔ اور اگر اس تحریک میں انگریز کے ساتھ دوستی کا پہلو نکلتا تھا تو اسے محض مصلحت کا تقاضہ سمجھنا چاہیئے۔ اس کی ایک وقتی اور عارضی حیثیت تھی۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض خود غرض اور رجاہ طلب مسلمانوں نے اس کو اپنی ذاتی ترقی کا ذریعہ بنالیا اور مسلمانوں میں ایک جماعت پیدا ہوئی جو زیادہ سے زیادہ منفعت حاصل کرنے کے لئے انگریز پرستی پر اُتر آئی۔ ظاہر ہے کہ انگریز دوستی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کا سیاسی نصب العین نہیں قرار دیا جاسکتا تھا۔ قوم کے جن محسنوں نے یہ سبق دیا کہ سیاست میں انھیں اپنے لئے ایک نئی اور آزاد راہ نکالنی چاہیئے ان میں اقبال کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کو اس راہ پر گامزن ہونے کی دعوت دی جو سیدھی پاکستان کی طرف لے جاتی تھی

اقبال نے ہوش سنبھالا تو نہ صرف اسلامیان ہند بلکہ شدہ سے عالم اسلام پر جمود طاری تھا۔ تقریباً سبھی اسلامی ممالک مغربی طاقتوں کی غلامی کا طوق پہنے ہوئے تھے اور بے چارگی اور بے بسی کی زندگی پر قانع معلوم ہوتے تھے۔ نہ صرف "متاعِ کارواں" لُٹ چکا تھا، غضب تو یہ تھا کہ "کارواں کے دل سے احساسِ زیاں" بھی جاتا رہا تھا۔ اقبال نے مسلمانوں کو ذلیل و خوار ہوتے ہوئے دیکھا تو اس کے دل پر سخت چوٹ لگی اور اس نے کہا:-

ہوگئی رُسوا زمانہ میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز

مغربی طاقتوں کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ عالمِ اسلام اسی طرح ان کے چنگل میں پھنسا رہے بلکہ اس پر اُن کی گرفت اور سخت ہو جائے۔ وہ محکومی اور غلامی کو اپنے لئے نعمت سمجھتا رہے اور اسی میں اپنی آسودگی محسوس کرتا رہے۔ اس کوشش میں انھیں غیر معمولی کامیابی بھی حاصل ہوئی ــــــــ اقبال کے الفاظ میں:-

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر ۔۔۔ پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادُوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز ۔۔۔ دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

مغربی تعلیم، مغربی تقلید اور مغرب کی محکومی کا اثر مسلمانوں کے کردار پر طاقتوں کے حسب مرضی پڑا، کیا عوام اور کیا خواص سب کے سب ایک عضوِ معطل بن کر رہ گئے۔ انھوں نے

اپنے ماضی کو بھلا دیا۔ وہ اپنی بے عملی، بے حسی اور جمود کو تقدیر کا کرشمہ سمجھنے لگے، اور اپنی زبوں حالی کا ذمہ دار نعوذ باللہ خدا کو ٹھہرانے لگے۔ اقبال نے انھیں جھنجوڑا۔ مسئلہ تقدیر پر اقبال نے اکثر طبع آزمائی کی ہے اور مسلمانوں کی غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے:

تقدیر کے پابند جمادات و نباتات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

دوسری جگہ دریافت کرتے ہیں:۔

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟ خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

ایک اور شعر جو بہت مشہور ہوا:۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

مکالمۂ ابلیس و یزداں میں جو ابنِ عربی سے ماخوذ ہے اقبال نے نہایت ہی لطیف پیرائے میں اسی موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ ابلیس آدم کے سامنے سجدہ نہ کرنے کا سبب بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

حرفِ استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا
ہاں مگر تیری مشیّت میں نہ تھا میرا سجود

یزداں کب کھلا تجھ پر یہ راز، انکار سے پہلے کہ بعد؟
ابلیس بعد، اے تیری تجلّی سے کمالاتِ وجود

یزداں

پستیٔ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجّت اسے کہتا ہے "تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود"
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

اقبال کو یہ دیکھ کر بڑا ہی دکھ ہوتا تھا کہ مسلمان جس نے ایک دنیا پر حکومت کی تھی اسے کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سر دارا۔ اور جو کبھی جہانگیر و جہاں دار و جہاں

جہاں آرا" رہ چکا تھا اور جس کو یہ دعویٰ تھا اور صحیح طور پر کہ:

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے

جس کی بہادری اور شجاعت کا ساری دنیا لوہا مانتی تھی، جس کی بے باکی ضرب المثل تھی، جس کا شوقِ شہادت دنیا کے لئے ایک عجوبہ تھا۔ وہی مسلمان کس طرح ذلت اور خواری اور محکومی اور غلامی پر نہ صرف آمادہ نظر آتا تھا بلکہ اسے اپنے لئے ایک قدرتی امر تصوّر کرتا تھا۔

اقبال نے مسلمانوں کو آزاد اور محکوم کا فرق سمجھایا۔ کیا خوب کہا ہے:۔

آزادی کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے، مانندِ رگِ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طربناک
آزادی کی دولت دلِ روشن، نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک
محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروّت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک

غلامی اور آزادی کی زندگی کو یوں بیان کیا:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

اقبال نے یہاں تک شرم دلائی کہ کتا بھی تو کتے کے سامنے سر نہیں جھکاتا اور تم اشرف المخلوقات ہو کر اپنی نوع کے سامنے سر جھکاتے ہو!

اقبال نے نہ صرف وہ اسباب کھول کر بیان کئے جن کی بنا پر مسلمان اپنے اسلاف کی میراث سے محروم کر دئے گئے تھے بلکہ وہ راستہ بھی بتا دیا جسے اختیار کر کے وہ دوبارہ عظمت حاصل کر سکتے تھے۔ مسلمانوں کا زوال ان کے یقین کی کمزوری اور عمل کے فقدان سے پیدا ہوا تھا۔ اقبال نے مسلمانوں کو خودی اور خود اعتمادی کا سبق دیا اور عمل کی دعوت دی۔!

ہر مسلماں رگِ باطل کے لئے نشتر تھا　　اس کے آئینہ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسہ تھا اسے قوتِ بازو پر تھا　　ہے تمہیں موت کا ڈر اس کو خدا کا ڈر تھا

اقبال نے مسلمانوں کو اپنی خودی پر یقین پیدا کرنے کی کوشش کی اور خدا پر بھروسہ کی کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے کچھ جدا نہ تھے :۔

ہم ز خودی خدا طلب　　،　　ہم ز خدا خودی طلب

اقبال کے فلسفۂ خودی پر کچھ کہنے کا یہ موقع نہیں، کسی موضوع پر اقبال کو اتنا اصرار نہیں معلوم ہوتا جتنا اس پر ہے۔ فلسفۂ خودی اقبال کی تعلیمات کا مرکزی نقطہ ہے۔ صرف چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔ ساقی نامہ میں کیا خوب کہتے ہیں :۔

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے　　خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات　　خودی کیا ہے بیداری کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے　　نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی　　ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی　　دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں　　پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں
اسے واسطہ کیا کم و بیش سے　　نشیب و فراز و پس و پیش سے
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر　　ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

دو اور شعر سن لیجئے :۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی　　کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے　　جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو رُوسیاہی

اقبال کے نزدیک زندگی عمل کے بغیر موت سے بدتر ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کو برابر

عمل پر اُکسایا کہ اسی سے تو یں بنتی ہیں :۔

راز ہی راز ہے تقدیر جہانِ تگ و تاز — جوشِ کردار سے کھُل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع — کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر — جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

اور ایک دوسری جگہ کہتے ہیں :۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

مگر عمل کے لئے یقین اور اپنے اُوپر اعتماد ضروری ہے۔

(ع) "یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے" اور

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبال نے مسلمانوں کے زوال کا بڑا سبب صحیح طور پر انتشار و افتراق کو قرار دیا تھا۔ چنانچہ اتحادِ ملت پر بار بار زور دیتے ہیں :۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اور اسی اتحاد میں اقبال کے نزدیک مشرق کی نجات مضمر ہے :۔

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتہ سے اب تک بے خبر

ایک نظم میں کس خوبصورتی سے اتحاد کی تلقین کی ہے :۔

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ — ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے — کچھ واسطہ نہیں ہے اُسے برگ و بار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو — نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطۂ اُستوار رکھ — پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

اور ایک دوسری نظم "بزمِ انجم" میں ستاروں کی زبانی یہی نکتہ بیاں کرتے ہیں:

روانِ ہستی ہے تیز گام ایسا — قومیں کچل گئی ہیں جس کی روا روی میں
عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے — جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں
جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے — پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

غرض مسلمانوں کو جو سوئے ہوئے تھے اقبال نے جگایا، عمر بھر انہیں عمل کی دعوت تے رہے۔ انہیں شاہین کی بلند پروازی اور بے نیازی سکھاتے رہے، ان کو روباہی سے فر کرکے ان میں شیر کی حرارت اور بے جگری پیدا کرنے پر زور دیتے رہے۔ یہاں تک اکہ غلط عمل بھی بے عملی سے بہتر ہے اس لئے کہ زندگی کشمکش کا دُوسرا نام ہے اور بے عملی موت مترادف ہیں۔ انھوں نے انقلاب کو زندگی کا جزو سمجھا۔

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب

اقبال نے صرف شعر وسخن کے ذریعہ مسلمانوں کو آنے والے انقلاب کے لئے تیار نہ ا بلکہ بحیثیت ایک سیاسی مفکر کے ان کے سامنے ایک ایسا اعلیٰ نصب العین رکھا جو مسلمانوں ، تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے ایک نئی اسلامی مملکت کا تخیل لمانانِ ہند کے سامنے پیش کیا

مسلمانانِ ہند کی حالت دوسرے مسلمانوں کی نسبت زیادہ کمزور تھی۔ اس لئے کہ سروں کو تو صرف مغرب کی غلامی سے نجات حاصل کرنی تھی، صرف ایک دشمن سے مقابلہ کرنا ا، مگر اس برصغیر کے مسلمان تو چکی کے دو پاٹوں کے درمیان تھے۔ ایک طرف مغربی ستعماری طاقتیں تھیں اور دوسری طرف ایک نئی استعماریت کا خواب دیکھنے والے برادرانِ طن تھے۔ بڑے سنگ دل، بڑے خود غرض، بڑے تنگ نظر۔ مسلمانوں کو ایک طرف انگریزوں سے چھٹکارا پانا تھا اور دوسری طرف اس برِصغیر میں اپنے لئے باعزت، پُرامن اور آزاد ندگی کا سامان مہیا کرنا تھا۔ انھوں نے باعزت مفاہمت کی بڑی کوششیں کیں اور ہر بار

ان کو مایوس ہونا پڑا۔ برادرانِ وطن کو اپنی اکثریت پر ناز تھا، اپنی ترقی پر غرور تھا، اپنی دولت کا گھمنڈ تھا، وہ سمجھتے تھے کہ دوسری تمام قومیں اُن کے سامنے جھک جائیں گی اور ان کی غلامی قبول کرلیں گی۔

اقبال جو مسلمانوں کو سربلند و مفتخر دیکھنا چاہتے تھے کیسے خاموش رہتے۔ انھوں نے اپنے ۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت میں جو مسلم لیگ کے الہ آباد والے اجلاس میں پڑھا مسلمانوں کے سامنے ایک نئی تجویز پیش کی۔ وہ تجویز یہ تھی کہ مسلمان اپنے لئے علحدہ ایک گوشۂ عافیت بنائیں جہاں وہ آزادانہ طور پر فروغ پاسکیں۔ اقبال نے مسلمانوں کے سامنے پاکستان کا تخیل پیش کیا اور قائداعظم کی توجہ اس طرف دلائی۔ اس تخیل کو دس سال بعد قائداعظم کی قیادت میں مسلم لیگ نے اپنایا اور یہ اقبال کی وفات کے نو سال بعد ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی صورت میں ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آیا۔ صحیح معنوں میں اقبال پاکستان کا معنوی خالق ہے۔

آج بھی اقبال کا پیغام قدم قدم پر ہماری رہبری کر رہا ہے۔ ہمیں ہمت دلا رہا ہے۔ ہمیں آگے بڑھنے پر اُکسا رہا ہے۔ اقبال کے حضور میں اپنی عقیدت کا بہترین خراج یہ ہے کہ ہم کبھی اس پیغام سے غافل نہ ہوں، اس لئے کہ اگر اسے سامنے رکھیں گے تو آگے ہی قدم اُٹھے گا۔ یہاں تک کہ اس کی پیشین گوئی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

حقیقت بن کر دُنیا کے سامنے آجائے گی۔

محمود حسین

سیّد جمال الدین افغانی

انیسویں صدی عالم اسلام کے لئے بڑی تاریک صدی تھی۔ جس طرف نظر دوڑائیے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ برصغیر ہند و پاکستان میں گو مسلمانوں کا زوال تواٹھارویں صدی ہی میں شروع ہو گیا تھا مگر ان کی قوت کا شیرازہ مکمل طور پر انیسویں صدی میں آکر بکھرا۔ اسی طرح ترکوں کا قافلہ جو کبھی پولینڈ میں وارسا اور آسٹریا میں ویانا کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر سے پستی کی جانب رواں ہو چکا تھا اور انیسویں صدی میں تو عثمانی سلطنت کے لئے یورپ کے "مرد بیمار" کی اصطلاح وضع کی گئی تھی اور واقعی عثمانی سلطنت تھی بھی۔ مرد بیمار جس کی موت کے انتظار میں یورپ کی حریص قومیں تاک لگائے بیٹھی تھیں ایران کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور وہ بیرونی اقوام کی ریشہ دوانیوں کا شکار تھا۔ مرکزی ایشیا میں روس اپنے سامراجی منصوبوں کی تکمیل میں مشغول تھا۔ اور خیوا اور بخارا اور سمرقند سب ایک ایک کر کے اس کے قبضۂ قدرت میں آ چکے تھے۔ مصر پر قبضہ جمانے کے لئے پہلے تو فرانسیسوں اور انگریزوں میں مقابلہ رہا۔ لیکن بالآخر انگریز اپنی سیادت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ فرانس اور اسپین مغرب (شمالی افریقہ) کے اکثر حصوں پر قابض ہو چکے تھے۔ غرض سیاسی طور پر دنیائے اسلام یا تو بلاواسطہ یا کم از کم بالواسطہ مغربی اقوام کے زیرِ نگیں آ چکی تھی اور اس کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی۔ ملت کا تصور باقی نہیں رہا تھا اور قوم پسندی ملت پسندی کی جگہ لے چکی تھی۔

اگر دنیائے اسلام کی اندرونی سیاست پر نظر ڈالی جائے تو جو نقشہ آنکھوں کے سامنے آتا ہے وہ ایسے نظام کا ہے جہاں جمہوریت نام کو نہ ہو۔ یہ ان اقوام کا حال تھا جو ایسے مذہب کے نام لیوا تھیں جس نے انسانی مساوات کا سبق سب سے پہلے دنیا کو دیا تھا اور جس نے مطلق العنان حکومت اور شہنشاہیت کا خاتمہ کیا تھا۔ ان اقوام میں جابر حکمراں برسرِ اقتدار

تھے۔ قوم کو بنیادی حقوق بھی حاصل نہ تھے۔ نہ آزادیٔ تقریر تھی نہ آزادیٔ تحریر۔ مطلق العنان خاندانی بادشاہت ساری اسلامی دنیا میں رائج تھی۔

معاشی طور پر اسلامی اقوام کا شمار پسماندہ اقوام میں ہوتا تھا۔ جن ملکوں نے ایک زمانہ میں صنعتوں میں غیر معمولی ترقی کی تھی ان کا بھی اب زیادہ تر زراعت پر دارومدار تھا اور زراعت بھی نہایت غیر ترقی یافتہ شکل میں۔ صنعتی انقلاب کا جس نے مغربی دنیا کی کا یا پلٹ دی تھی اُدھر سے گذر نہیں ہوا تھا۔ معاشی ناہمواری بڑی مہیب صورت اختیار کر چکی تھی، ایک طرف چند لوگوں کے لئے دولت کی ریل پیل تھی اور دوسری طرف غربت و افلاس کے بھیانک بوجھ تلے لاکھوں کروڑوں انسان بری طرح دبے ہوئے تھے۔ صحت عامہ کا معیار نہایت پست ہو چکا تھا اور عمر کا اوسط گرتا جا رہا تھا۔ اخلاقی نقطۂ نگاہ سے ملت کے اکثر افراد صفات حسنہ سے محروم ہو چکے تھے۔ تعلیمی اعتبار سے اسلامی دنیا جس نے کبھی یورپ کو علوم و فنون میں نئی نئی راہیں دکھائی تھیں وہاں اب علم کا چراغ گل ہو چکا تھا۔ تعلیم تو بڑی چیز ہے۔ معمولی طور پر لکھنے پڑھنے سے بھی بڑی اکثریت محروم تھی۔ ناخواندگی گویا ہماری طرزِ زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔ مذہبی علماء اپنا وقت زیادہ تر فقہی موشگافیوں پر صرف کرتے اور زندگی کے اہم مسائل کی طرف توجہ نہ دیتے تھے۔

ایسی صورت میں تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ اسلامیوں کے کرتوت کی وجہ سے خود اسلام پر حملے شروع ہو گئے تھے اور ہماری پسماندگی کو ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہوئے یورپ کے دانشور ببانگ دہل کہتے تھے کہ اسلام میں موجودہ زمانے کے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

یہ تھی وہ صورت حال جس میں انیسویں صدی میں سب سے بڑا اسلامی مفکر پیدا ہوا اس نے حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا، مرض کی تشخیص کی اور اس کا علاج تجویز کیا۔ جیسا کہ اقبالؔ نے ایک جگہ کہا ہے "قدرت کے طریقے بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ مذہبی فکر و عمل کے لحاظ سے ہمارے زمانہ کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ مسلمان افغانستان میں پیدا ہوتا ہے۔ جمال الدین دنیائے اسلام کی تمام زبانوں سے واقف تھے۔ ان کی فصاحت و بلاغت میں سحر آفرینی ودیعت تھی۔ ان کی بے چین روح ایک اسلامی ملک سے دوسرے اسلامی ملک

کا سفر کرتی رہی اور اس نے ایران، مصر اور ترکی کے ممتاز ترین افراد کو متاثر کیا۔ ہمارے زمانے کے بعض جلیل القدر علما جیسے مفتی محمد عبدہ اور نئی پود کے افراد جو آگے چل کر سیاسی قائدین گئے جیسے مصر کے سعد زاغلول پاشا وغیرہ ان ہی کے شاگردوں میں سے تھے۔ انھوں نے لکھا کم اور کہا بہت اور اس طریقے سے ان تمام لوگوں کو جنہیں ان کا قرب حاصل ہوا۔ چھوٹے چھوٹے جمال الدین بنا دیا۔ چند الفاظ میں اقبال نے علامہ جمال الدین افغانی کا بڑا ہی جامع جائزہ پیش کر دیا ہے۔ خصوصاً اقبال کا یہ کہنا خاص معنی رکھتا ہے کہ "ہمارے زمانے کے کسی شخص نے روح اسلام میں اس قدر تڑپ نہیں پیدا کی جس قدر کہ انھوں نے پیدا کی تھی۔"

جمال الدین افغانی کون تھے اور ان کے وہ کون سے تخیلات تھے جنھوں نے روح اسلام کو تڑپ عطا کی؟ آج کی مختصر سی گفتگو کا مقصد یہی ہے کہ ان سوالوں کا جواب تلاش کیا جائے۔

سید جمال الدین افغانی ۱۸۳۹ء میں افغانستان کے علاقہ کونڑ (KUNAR) میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق سادات کے ایک خاندان سے تھا جسے پیر سعید علی عرف پیر بابا کی وجہ سے عرصہ سے شہرت حاصل تھی۔ آپ کے والد سید صفدر بھی اپنے وقت کے بڑے علما میں سے تھے اور افغانستان میں خاصہ اثر درسوخ رکھتے تھے۔ سید جمال الدین افغانی کا اٹھارہ انیس سال کی عمر تک افغانستان ہی میں قیام رہا اور اس عرصے میں انھوں نے جو علم حاصل کیا وہ اپنے والد بزرگوار اور بعض دوسرے اساتذہ سے جن میں خاص طور پر سید فقیر بادشاہ کا نام آتا ہے۔ حاصل کیا۔ والد کی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے ایک وقت وہ تھا کہ امیر کابل دوست محمد خاں انھیں بہت عزیز رکھتا تھا۔ پھر ایسا بھی زمانہ آیا کہ وہ معتوب ہوئے۔ جائیداد ضبط ہوئی لیکن ایک عرصہ بعد واپس کر دی گئی۔ سید جمال الدین تقریباً انیس سال کے تھے کہ ۱۸۵۶ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔

اسی سال یعنی ہندوستان کی جنگ آزادی سے ایک سال پہلے انھوں نے ہندوستان کا سفر اختیار کیا۔ یہ ان کی زندگی کا جس کا بیشتر حصہ اپنے آبائی وطن سے دور گذرا۔ پہلا سفر تھا۔ یہاں انھوں نے ان حالات کا بذات خود مشاہدہ کیا جو ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا تختہ الٹنے اور غیر ملکی حکومت قائم ہونے سے پیدا ہوئے تھے۔ ایک سال کے قیام کے بعد

ب حجاز گئے۔ فریضۂ حج ادا کیا پھر شام و فلسطین، عراق اور ایران کا سفر کیا اور اس طرح دو سال باہر گذار کر افغانستان واپس آئے۔ اس عرصہ میں سید صاحب کو اس کا موقع ملا کہ مسلمانوں کے حالات کا مطالعہ کریں اور ان کے دکھ کا مداوا تجویز کریں۔

اب سید جمال الدین افغانی کی زندگی کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس میں دنیائے اسلام کے سامنے وہ ایک مصلح کی حیثیت سے آتے ہیں۔ ان کا وقت ایران، افغانستان، مصر، ترکی فرانس وغیرہ میں گذرتا ہے اور ترکی میں وہ ۱۸۹۷ء میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملتے ہیں۔ وہ ترکی ہی میں دفن ہوئے۔ مگر نصف صدی بعد افغانستان کے اسرار پر ان کا جسد خاکی افغانستان لایا گیا اور اب وہ کابل میں مدفون ہیں۔

سب سے پہلی چیز جو سید جمال الدین افغانی کی توجہ کا مرکز بنی وہ مسلمانوں کی پسماندگی تھی۔ بیرونی طور پر ان کا اغیار کے زیرِ حکومت یا کم از کم زیر اثر آنا اور اندرونی طور پر ایک طرف مطلق العنان حکومت جو انفرادی آزادی کی نفی کرتی تھی اور دوسری طرف ناگفتہ بہ معاشرتی حالات ان تمام خرابیوں کا بنیادی سبب سید جمال الدین افغانی کی نظر میں یہ تھا کہ مسلمانوں نے اسلام کی سچی تعلیمات کو سرے سے بھلا دیا تھا اور وہ غفلت کی نیند سو رہے تھے۔ نہ انھیں اپنے نقصان کا علم تھا نہ نفع کی آرزو۔ افغانی نے اہل اسلام کو خواب غفلت سے جگایا اور اپنی سحر بیانی اور شعلہ نوائی سے ان کے دلوں میں ولولہ پیدا کیا۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں جو تحریکیں عالم اسلام میں اٹھیں اور ان سب کا ناطہ کسی نہ کسی شکل میں افغانی کی تعلیمات سے جا کر ملتا ہے۔

جس طرح افغانی نے مسلمانوں کو جھنجھوڑا اس کی ایک مختصر سی مثال ان کے ایک مقالہ کے اردو ترجمہ سے دینا نامناسب نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں" خدائے تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید میں ہم مسلمانوں سے وعدے فرمائے ہیں، بشارتیں دی ہیں، بزرگی اور سیادت کا مژدہ سنایا ہے جس کے مطابق اسلام کو تمام دینوں اور مذہبوں پر برتری حاصل ہے.... خداوند تعالیٰ دین حنیف۔ اسلام کو تمام ادیان و مذاہب پر غلبہ دیتا ہے تاکہ ان کو سراسر نیچا دیکھنا پڑے اور اس پر خود اسلام کے غلبہ و تسلط کا زمانہ شاہد ہے ..... اللہ تعالیٰ

نے امت اسلامیہ کو ایک قلیل تعداد اور مختصر جماعت سے ابھارا ۔ ان کی ہر جہتی حالت کو عظمت کے اعلیٰ مدارج پر پہنچایا کر بڑے بڑے فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں پر ان کے قدموں کی مہریں لگ گئیں ۔ کوہ و بیابان ان کے رعب و داب سے لرز گئے ان کے نام سننے سے دل کانپنے لگے اور ان کی ہیبت سے جسموں پر رعشہ طاری ہونے لگا ۔ بڑے بڑے نام آوارد کے پتے پانی ہو گئے اور ان کی فوق العادت ترقی نے ہر عقلمند کو تحیر میں ڈال دیا اہلِ عالم عبرت سے انگشت بدنداں رہ گئے ۔ " اس کے بعد افغانی ان عظیم الشان سلطنتوں کا ذکر کرتے ہیں جو مسلمانوں نے قائم کیں اور پھر کہتے ہیں :۔ " مگر اب یہ کیسی بد بختی ہے کہ آج مسلمانوں کے ممالک تباہ حال ہیں ۔ ان کی دولت لٹ گئی ۔ اجنبی حکومتیں ان کی مملکتوں پر تصرف کرتی جاتی ہیں اور ان کی دولت و ثروت کے دوسرے مالک بنتے جا رہے ہیں ۔ کوئی روز ایسا نہیں جاتا کہ اغیار ان کے علاقوں پر اپنا پنجہ آز نہ بڑھا تے ہوں اور کوئی رات ایسی نہیں گذرتی کہ ان کا ایک نہ ایک گروہ زیرِ حکومت و اطاعت نہ لایا جاتا ہو ۔ ان کی آبرو اور ان کے شرف و بزرگی کو ٹھیس نہ لگائی جاتی ہو ۔ نہ تو کہیں ان کا حکم چلتا ہے اور نہ ان کی کوئی بات قابلِ شنوائی ہے ۔ غلامی کی زنجیریں ان پر کسی جا رہی ہیں اور طوقِ بندگی ان کی گردنوں میں پہنایا جا رہا ہے .... " وغیرہ وغیرہ اس کا سبب افغانی کی رائے میں کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ :۔ " ظاہر ہے کہ خدا کے وعدے غلط نہیں ہوا کرتے ، تو پھر مسلمانوں کی عزت و رفعت کیا ہوئی اور ان کی حشمت و شوکت کہاں گئی ؟ اور ان کے تنزل کا سبب کیا ہے ۔ تو جواب دیتے ہیں کہ سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہوا ہے ۔ " ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم " یعنی ۔ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی ۔ نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا ۔

جمال الدین افغانی نے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے تین علاج تجویز کئے : ایک پان اسلامزم (PAN ISLAM) دوسرے جمہوری طریقہ حکومت اور تیسرے اسلام کی تجدید ۔

سید جمال الدین افغانی نے دورِ جدید میں بین اسلام (PAN ISLAM) یا بین الملیت کے سب سے پہلے علمبردار اور مبلغ ہیں ۔ وہ وطن دوست تھے ، وطن پرست ،

قوم پرست نہیں تھے۔ اس لئے کہ وطن پرستی اسلام کے تصور ملت اور اس کی عالمگیر روح کے منافی ہے۔ یوں بھی ان کا خیال تھا کہ مغربی دول جو اسلامی ممالک کو ایک ایک کر کے ہڑپ کرتی جا رہی تھیں اگر انھیں اسلام کی متحدہ قوت سے مقابلہ کرنا ہوتا تو ان کے لئے کامیابی ایسی سہل نہ ہوگی"

ہمارے زمانے میں اقبال سید جمال الدین کے اس خیال سے بہت متاثر ہوئے ہیں، جنھوں نے مسلمانوں کو یہ دعوت دی کہ:-

"بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی"

ان کا ترانۂ ملی اردو داں لوگوں میں زبان زد خاص و عام ہے۔ اور ان کا کلام اس خیال سے سرشار ہے۔ ہمارے سیاسی قائدین میں مولانا محمد علی پر ان کے خیالات کا نمایاں اثر ہوا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو سید جمال الدین افغانی نے مسلمانوں کے اتحاد کا نعرہ لگا کر کوئی نیا اصول نہیں وضع کیا تھا بلکہ اسلام کی قدیم اور بنیادی تعلیم کی طرف مسلمانوں کی توجہ دلائی تھی۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی قومیت کی اسی وقت داغ بیل ڈالی تھی جب انھوں نے عرب قوم کی بجائے ملّت اسلامیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ اور اس ملّت کے اندر رنگ اور نسل اور غریب اور امیر کے فرق کو ختم کر دیا تھا اور ارشاد خداوندی کے بموجب انفرادی برتری کی بنیاد تقویٰ پر رکھی تھی۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقیکم۔ مسلمانوں نے اس سبق کو بھلا دیا تھا۔ اور نسلی اور قومی عصبیتوں نے ان کے دلوں میں اپنے لئے جگہ کر لی تھی۔ جمال الدین افغانی نے مسلمانوں کو وہ راہ دکھائی جو قوم پرستی سے بین الملیت کی طرف لے جاتی تھی۔

مگر جمال الدین افغانی وطن دوست تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ وطن دوستی کے جذبے کو ٹھیس لگے۔ اس جذبہ سے انھیں کام لینا تھا۔ مسلمان ممالک کے سامنے غیروں سے نجات حاصل کرنے کا مسئلہ تھا اور وطن دوستی کا جذبہ اس میں بہت مدد ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اکثر تحریکیں جن کا مقصد اپنے کو غیروں کے تسلط سے آزاد کرانا تھا اور جو مسلم ممالک میں جاری ہوئیں، ان کا ناطہ جمال الدین افغانی کے افکار اور ان کی کوششوں سے جا کر ملتا ہے۔ مصر اس کی خاص طور پر اہم مثال ہے جہاں افغانی کے شاگردوں نے ملک کو آزاد کرانے میں بڑھ چڑھ کر

حصّہ لیا۔ دوسری بات جس کی طرف جمال الدین افغانی نے مسلمانوں کی توجہ مبذول کرائی وہ یہ تھی کہ جابرانہ اور مطلق العنان حکومتوں کی بجائے مسلمان ملکوں میں ایسی حکومتیں قائم ہوں جن میں انفرادی آزادی ہو اور حکمرانوں کو بے حد حساب طاقت حاصل نہ ہو بلکہ وہ قوم کے سامنے جوابدہ ہوں۔ اس بات کو وہ کس قدر اہمیت دیتے تھے کہ استبداد ختم ہو، ان کے ایک ایسے خط سے ظاہر ہے جو انھوں نے وفات سے کچھ ہی قبل اپنی نظر بندی کے زمانے میں قسطنطنیہ سے ایک ایرانی دوست کو لکھا تھا اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اس خط کو ایرانیوں تک پہنچا دیں۔ کہتے ہیں! " تم نے کہ ایران کی بیداری کے لئے کمر ہمت کس لی ہے قید و بند و غارت گری سے نہ ڈرنا، ایرانی جہالت سے خستہ نہ ہونا۔ سلاطین کی حرکات مذبوحی سے نہ گھبرانا۔ نہایت سرعت کے ساتھ اُس کی اصلاح کی کوشش اور نہایت مستعدی کے ساتھ کوشش کئے جاؤ، فطرت تمھارے ساتھ ہے اور خالقِ فطرت تمھارا مددگار ہے۔ تجدد کا سیل تیزی کے ساتھ مشرق کی طرف رواں ہے۔ مطلق العنان کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ تمھیں چاہیئے کہ مطلق العنان حکومت کی بنیادی خرابیوں کی اصلاح کرو ....."

تاآخر میں یہ ذکر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اسلام کی نئی تعمیر کی اور مسلمانوں کو تجدد کی راہ پر ڈالا۔ اس پر نہیں کہ جو مغرب کہے وہ صحیح سمجھا جائے اور اسلام کو اس پر چسپاں کر دیا جائے بلکہ اس طرح کہ واقعی آج کا انسان اسلام کے صحیح معنیٰ سمجھ سکے اور اس میں جو غیر اسلامی تخیلات و رسوم داخل ہوگئی ہیں ان کا خاتمہ کیا جاسکے۔

یہ تھا ایک مختصر سا خاکہ سید جمال الدین افغانی کے افکار و خدمات کا۔ جمال الدین افغانی نے اپنے خیالات کی اشاعت کے لئے بڑی بڑی صعوبتیں برداشت کیں۔ وطن ہی سے نہیں کئی اسلامی ممالک سے نکالے گئے اور آخر میں بحالت نظر بندی ترکی میں ان کا انتقال ہوا، مگر اس دھن کے پکّے انسان کو کوئی مصیبت اور کوئی تکلیف اپنی راہ سے نہیں ہٹا سکی۔ ایسے ہی لوگ نہ صرف تاریخ میں یاد رکھے جاتے ہیں بلکہ تاریخ ساز کہلاتے ہیں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

زکریا ساجد

بابائے صحافت، مولانا ظفر علی خاں

صحافت کو بجا طور پر عہدِ حاضر کا انقلاب آفرین ادارہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ گزشتہ دو صدیوں میں انقلاب فرانس سے لے کر روسی انقلاب تک کے سیاسی انقلابات کے علاوہ انسان کے صنعتی اور معاشرتی ماحول میں جو بنیادی تغیّرات رونما ہوتے ہیں۔ ان پر صحافت اور جدید ذرائع ابلاغ کا کردار نہایت بنیادی اہمیت کا حامل ہے، اور اسی اہمیّت کے پیشِ نظر مختلف حکومتیں اسلحہ جنگ کے ذریعے جارحیّت و مدافعت کی تیاری کے ساتھ ساتھ پراپگینڈا کی جنگ پر بھی بھرپور توجہ دیتی ہیں۔

دنیا کے دوسرے علاقوں کی طرح برِعظیم پاک و ہند کی سیاسی تاریخ میں بھی صحافت نے انقلابی کردار ادا کیا ہے۔ برطانوی سامراج کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ محکوم قوموں کو صحافت اور بالخصوص آزاد صحافت سے بے بہرہ رکھا جائے اور آمرانہ پریس قوانین اور دیگر ضابطوں کے ذریعے خوف و ہراس کی ایسی فضا قائم کی جائے کہ حکومت کے حامی اور ٹوڈی اخبارات تو بے شک پھلیں پھولیں۔ مگر حریت پسند اہلِ قلم کے لئے صحافت ہمیشہ ایک پُرخطر اور اذیت ناک سرگرمی ثابت ہو ــــــ اور ان کی زبان بندی کے لئے تخویف و تعزیر کے سبھی حربے روا رکھے جائیں ــــــ

ہماری قومی زندگی کا ایک درخشاں باب یہ بھی ہے کہ جہاں سیاسی اور فکری محاذ پر ملّت اسلامیہ کو چند پرخلوص اور اولوالعزم رہنما ودیعت ہوئے۔ وہاں میدانِ صحافت میں بھی ہمارے حصّے میں چند ایسے نڈر اور جیالے اہلِ قلم آئے۔ جنہوں نے دنیاوی جاہ و مرتبہ اور راحت و آسائش کو تج کر مصیبت و ابتلا کی زندگی اختیار کی۔ تاکہ ملّتِ اسلامیہ کو اس کی حقیقی منزل کی جانب متوجہ کیا جائے، اور

اسے انگریزوں اور ہندوؤں کے گمراہ کن پروپیگنڈے کا شکار ہونے سے بچایا جائے۔

میدانِ صحافت کے ان شہسواروں میں مولانا ظفر علی خاں اپنی طویل اور مجاہدانہ صحافتی زندگی اور خدمات کے باعث ایک منفرد حیثیت کے حامل ہیں اور اسی لیئے انہیں بجا طور پر پاکستان کا "بابائے صحافت" کہا جاتا ہے۔

ظفر علی خاں بھی مسلمان زعماء کے اسی کاروانِ حریت کے ایک ممتاز سالار ہیں۔ جو سر سید احمد خاں کے دور کی سیاسی مصلحت پسندی اور حکومت سے تعاون کی پالیسی کو خیرباد کہہ کر برطانوی سامراج سے ٹکر لینے کی کٹھن راہ پر رواں ہوا۔ تحریکِ خلافت تک کانگرس کے ساتھ اتحاد کی پالیسی پر کاربند رہ کر مسلم مفادات کا تحفظ کیا۔ مگر جب کانگرس کی ہندو نواز پالیسی طشت از بام ہوگئی۔ تو قائدِاعظم محمد علی جناح۔ علامہ اقبال۔ مولانا شوکت علی اور نواب بہادر یار جنگ کی طرح اسلامیانِ ہند کے لئے جداگانہ ریاست قائم کرنے پر اپنی تمام صلاحیتیں مرکوز کر دیں۔

تعلیم و تربیت

مولانا ظفر علی خان کوٹ مہرتھ (تحصیل وزیر آباد) میں ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وزیر آباد اور پٹیالہ میں ہوئی۔ میٹرک کے بعد ایم اے او کالج علیگڑھ میں داخلہ لیا اور ۱۸۹۵ء میں بی اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔

علیگڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں ہی آپ کا ذوقِ شعر و ادب ممتاز تھا۔ علامہ شبلی نعمانی اور پروفیسر آرنلڈ کی خصوصی توجہ نے ان کی صلاحیتوں کو اور نکھار دیا۔ انہوں نے بیک وقت انگریزی اُردو، عربی اور فارسی میں کمال تحریر و تقریر حاصل کیا جو بعد ازاں صحافتی زندگی میں ان کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے کچھ عرصہ بمبئی میں نواب محسن الملک کے سیکرٹری کے طور پر کام کیا اور پھر اپنے اُستاد مولانا شبلی نعمانی کی کوشش سے حیدر آباد میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں ان کا ذوقِ شعر و ادب اور نکھرا۔ اور آپ نے انگریزی کُتب کے ترجمے میں خصوصی مہارت کا ثبوت دیا۔ قیامِ حیدر آباد کے دَور میں آپ نے ۱۹۰۲ء میں ایک ماہنامہ افسانہ اور ۱۹۰۳ء میں

علمی و ادبی رسالہ دکن ریویو جاری کیا۔ اس جریدہ نے مولانا ظفر علی خان کی علمی ادبی شہرت کو ہندوستان کے ممتاز علمی حلقوں میں پہنچا دیا۔ اسی دور میں آپ نے بمبئی گزٹ اور ٹائمز آف انڈیا میں انگریزی مضامین بھی شائع کئے۔

مولانا ظفر علی خان کے والد مولوی سراج الدین احمد نے زمیندار کے نام سے ایک ہفت روزہ اخبار ۱۹۰۳ء میں جاری کیا تھا۔ جس کا مقصد زمینداروں اور کاشتکاروں کی فلاح و بہبود تھا۔ ۱۹۰۹ء میں مولانا ظفر خان نے اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق زمیندار کی ادارت سنبھالی اور پھر یکم مئی ۱۹۱۱ء سے اسے کرم آباد کی بجائے لاہور سے شائع کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اسے محض زمینداروں کا ترجمان بنانے کی بجائے مسلمانوں کے عمومی جذبات و مفادات کا آئینہ دار بنایا۔ اس میں موضوعات کا تنوع پیدا کیا اور تازہ ترین خبریں حاصل کرنے پر خصوصی توجہ دی نتیجتاً زمیندار کی اشاعت چند ہی ماہ میں دو ہزار تک پہنچ گئی۔

۸ اکتوبر ۱۹۱۱ء سے زمیندار کو روزنامہ اخبار بنا دیا گیا۔ اس وقت تک زمیندار ایک حریت پسند اور معیاری اردو اخبار کے طور پر اپنا لوہا منوا چکا تھا۔ چنانچہ روزانہ اشاعت شروع کرنے کے چند ہی دن بعد اخبار کی اشاعت پانچ ہزار سے بڑھ گئی۔ جو بالآخر تیس ہزار تک جا پہنچی۔ کثرت اشاعت کا یہ امتیاز حصولِ پاکستان سے پہلے کسی اور اُردو روزنامے کو نصیب نہیں ہوا۔

پہلا عوامی روزنامہ:۔ زمیندار کی قبولیت عامہ اور کثرت اشاعت کا راز مولانا ظفر علی خان کی اعلےٰ صحافتی صلاحیتوں اور عوامی پسند و ناپسند کے سلسلے میں ان کا امتیازی حسن احساس تھا۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد" زمیندار کی اشاعت سے پہلے اخبار بینی طبقہ خواص میں محدود تھی اور عام بیداری و احساس کے پیدا ہونے میں یہ ایک ایسا مانع عظیم تھا جس کی وجہ سے کوئی تحریک اور کوئی آواز عام قوت و اثر پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ جنگ طرابلس نے قوم کے تمام طبقات کو خبروں کا شائق بنایا اور زمیندار کی عام مقبولیت شروع ہو گئی۔ اس کی اشاعت بیس بیس ہزار روزانہ تک پہنچی اور اس کی ارزانی اور عام فہم ہونے نے اسے عام دکانداروں اور بازار میں بیٹھنے والوں تک پہنچا دیا" زمیندار نہ صرف خواندہ اور تعلیم یافتہ طبقہ ہی میں مقبول تھا بلکہ ناخواندہ لوگ بھی اسے خریدتے تھے اور دوسروں سے پڑھوا کر اپنے ذوق آگاہی کی تسکین کرتے تھے

پنے دورِ حیدرآباد میں مولانا ظفر علیخان لارڈ کرزن کی انگریزی کتاب کا ترجمہ (خیابان
اور ڈریپر کی کتاب "معرکۂ مذہب و سائنس" اور دیگر شاہپاروں اور مضامین کا ترجمہ
ا گیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ یہ تجربہ اور شہرت زمیندار کو ایک مثالی اور معیاری روز نامہ
ں بہت مددگار ثابت ہوئی۔ بقول مولانا محمد علی جوہر "مولانا ظفر علی خان جیسے جامع صفات
کبھی اس پیشہ میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے عوام کو زبان و بیان کے ایک ایسے
عادی بنایا جو ہماری صحافت میں موجود نہیں تھا اور اب یہ صورت پیدا ہو گئی ہے کہ زمیندار کے
پر دوسرے اخبار پھیکے اور بے مزہ معلوم ہوتے ہیں" فنی طور پر زمیندار نے خبر رساں
ں، اپنے نامہ نگاروں اور غیر زبانوں کے اخبارات سے تازہ ترین خبریں حاصل کر کے جہاں
ے دنیائے صحافت میں اعلیٰ مقام پیدا کیا۔ وہاں اس نے عصری مسائل پر فکر انگیز اداریے، مقالات
مین شائع کر کے اُردو صحافت کو انگریزی صحافت کے ہم پلہ بنایا۔

اگرچہ انگریزی اور کئی ہندوستانی زبانوں میں اچھے اور کامیاب اخبار پہلے سے
د تھے۔ مگر زمیندار جتنا معیاری اور کثیر الاشاعت روز نامہ اردو میں اس سے پہلے موجود
ما۔ اور پھر زمیندار نے حکومت اور رؤسا کی سرپرستی قبول کرنے کی بجائے عوام
مطالبات اور امنگوں کا ترجمان بننے کو قابلِ ترجیح سمجھا۔ اور اس طرح اپنے اعلیٰ معیار
حریت پسندی کے باعث اردو صحافت میں وہ مقام حاصل کیا۔ جو بعد ازاں بھی
ں دوسرے اخبار کو حاصل نہیں ہو سکا۔

زمیندار کو اس اعتبار سے بھی اردو صحافت میں تاریخی اہمیت حاصل ہے
اس نے نہ صرف خبروں کے حصول۔ ترتیب اور پیشکش اور مقالات و مضامین
ے تنوع اور بلند معیاری کے باعث نام پیدا کیا۔ بلکہ زمیندار اور مولانا ظفر علی خان
نے اردو صحافت کو بلند پایہ صحافیوں۔ صاحب طرز انشا پردازوں اور ادیبوں کی ایک
ی جماعت تیار کر کے دی۔ جس نے اردو ادب اور بالخصوص اردو صحافت کو جدید
ناضوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنایا اور اسالیب اظہار اور ظاہری محاسن کے
عتبار سے اسے انگریزی صحافت کا ہم پلہ بنا دیا۔ ہندوستان کی اخبار نویسی کی

بنیاد، چونکہ انگریزی جرنلزم کے اصول وضوابط - طرز تحریر - انداز طباعت واشاعت اور طریق کار پر رکھی جا رہی تھی۔ اس لئے اردو اخبار نویسی کی تدریس وتعلیم کے اہم کام سے وہی ادارہ عہدہ برآ ہو سکتا تھا جس کی تمام ذمہ داریاں کسی ماہر کامل اور یکتائے فن صحافی کے ہاتھ میں ہوں اور ایسا باکمال اخبار نویس ہندوستان کے سب سے بڑے صحافی مولانا ظفر علی خان کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں اور دونوں کے جرنلزم پر یکساں قدرت رکھتا ہو۔ چنانچہ اردو صحافت کی تعلیم و تدریس کا فرض زمیندار ہی کے حصہ میں آیا۔" (محمد اشرف خاں عطا صہ ۹ ۲۱)

زمیندار کے طویل عرصۂ حیات میں ادارہ سے منسلک اہل قلم کی فہرست مرتب کی جائے تو بلا مبالغہ وہ سینکڑوں پر محیط ہوگی۔ تاہم اپنے عہد کے چوٹی کے ادیبوں اور صحافیوں پر ہی نظر ڈالئے تو ہمیں مولانا عبداللہ العماری، مولانا نیاز فتحپوری، مولانا حمید الدین سلیم اور مولانا وجاہت حسین جھنجھانوی کے علاوہ مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا چراغ حسین حسرت، سید محمد جالب اور مولانا مرتضیٰ احمد میکش بھی اس درسگاہ صحافت کے فارغ التحصیل تلامذہ میں نظر آتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ شمالی ہند کے اردو اخبارات میں زمیندار کے تربیت یافتہ صحافیوں کی اتنی بڑی تعداد نے مختلف اوقات میں کوئی ہے کہ اردو صحافت پر اثرات مرتب کرنے میں کوئی اخبار زمیندار کا ہمعصر شمار نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ مولانا ظفر علی خان کے شعر وادب کے تحقیقی مطالعے میں اہل علم کی دلچسپی اب ایک سنجیدہ روایت بنتی جا رہی ہے۔ لیکن مولانا کی صحافتی زندگی اور بالخصوص زمیندار کا تاریخی مطالعہ ابھی تک (بالخصوص نئے اسالیب تحقیق ابلاغ وصحافت کی روشنی میں) طلبائے صحافت کی توجہ کا منتظر ہے۔

جامع صفات شخصیت

زمیندار نے حق پرستی اور قومی مفاد کی بے باکانہ ترجمانی کے لئے ضبطیٔ ضمانت اور جرمانے کی صورت میں اور مولانا ظفر علیخان نے طویل قید و بند کی صورت میں قربانیوں کی جو مثالیں قائم کی ہیں ان کی نظیر دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی آسانی سے نہیں ملتی۔ قربانیوں کا یہ سلسلہ ۱۹۱۳ء سے شروع ہوا اور حصولِ آزادی تک قائم رہا۔ قارئین کی زمیندار سے والہانہ محبت بھی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ جب کبھی زمیندار کی ضمانت ضبط ہوئی قارئین نے نئی ضمانت کے لئے چندہ فراہم کر کے اپنی حریت پسندی اور زمیندار نوازی کا ثبوت فراہم کیا اور زمیندار کی بندش کے دَور میں ستارہ صبح اور دوسرے ناموں سے مولانا ظفر علیخان نے جو اخبارات و رسائل جاری کئے۔ قارئین نے انہیں بھی نہایت ذوق و شوق اور قبولیت سے خریدا اور کامیاب بنایا۔

اعلیٰ پائے کے شاعر و ادیب اور خطیب و صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا ظفر علیخاں اپنے دَور کے صفِ اوّل کے سیاستدان تھے۔ انہوں نے اپنے معاصرین کی طرح کانگرس تحریک خلافت، مجلس احرارِ اسلام، مجلس اتحاد اور مسلم لیگ میں بھرپور حصّہ لیا۔ لیکن ان کی سیاست کا یہ خاصہ رہا کہ انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کے مفاد کو عزیز خاطر رکھا۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء کے بعد جب مسلم لیگ کی تنظیم نو ہوئی۔ تو انہوں نے اپنی تمام صلاحیتیں مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے لئے وقف کر دیں اور اپنی صحافت و خطابت کے ذریعے اسلامیانِ ہند کو حصول پاکستان سے ہمکنار کیا۔ ۱۹۴۵ء کی انتخابی مہم میں جس میں مولانا ظفر علی خود بھی مرکزی اسمبلی کے لئے مسلم لیگ کی طرف سے رکن منتخب ہوئے انہوں نے مسلم لیگ کو کامیاب بنانے میں جو حصّہ لیا وہ تاریخ کے اوراق پر ہمیشہ ثبت رہے گا۔

۱۹۴۶ء کے بعد مولانا کی صحت نے ان کی پرجوش سیاسی و صحافتی سرگرمیوں کا ساتھ نہ دیا۔ اور انہوں نے بیشتر وقت کرم آباد میں گزارا۔ جہاں ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا

کتابیات

۱۔ مولانا ظفر علی خان از محمد اشرف خان عطا
۲۔ ظفر علی خان، ادیب، شاعر از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
۳۔ ظفر علی خان از شورش کاشمیری
۴۔ صحافت پاکستان و ہند میں از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید
۵۔ بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل، شورش کاشمیری
۶: سرگزشت عبدالمجید سالک
۷: زمیندار کے چیدہ فائل

بیگم ثاقبہ رحیم الدین خان

معاشرے میں ادب کی اہمیت

آج کی گفتگو کا موضوع "معاشرے میں ادب کی اہمیت" ہے۔ اس موضوع کا انتخاب اس لئے ذہن میں آیا کہ اس کا ہماری ملّی اور قومی زندگی سے گہرا رشتہ ہے اور یہ رشتہ نظریاتی بحثوں میں ایسا اُلجھا دیا گیا ہے کہ اصل موضوع، روشنی میں آنے کے بجائے دُھندلکے میں چلا گیا ہے۔ اس دُھند کا دُور ہونا، ادب کی بقا و ترقی کیلئے ضروری ہے۔ اس کے علاوہ موضوع، دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ دُور رَس نتائج بھی رکھتا ہے۔

اہلِ علم کے اس اجتماع میں[۱] جہاں ادیب، شاعر، نقّاد، اور ادب نواز خواتین و حضرات موجود ہیں۔ میرا اظہارِ خیال کرنا ایک جسارت ہے۔ لیکن ایک چیز میری ہمّت بندھاتی ہے۔ وہ یہ کہ معاشرہ ہی ادیب کو جنم دیتا ہے، اور پھر ادیب ہی اس کے رُوپ کو سنوارتا یا بگاڑتا ہے۔ جہاں یہ بات دُرست ہے کہ اہلِ قلم اور ذوقِ نظر رکھنے والے حضرات، ادب سے زیادہ مستفید اور لُطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ وہاں یہ بھی ایک صداقت ہے کہ ادب بنیادی طور پر میرے آپکے اور دوسروں کی تمدّنی زندگی ہی سے عبارت ہے۔ ادب کو کچھ اس طرح تشبیہ دیجئے جیسے ادب ساری دُنیا کی سیرابی کے لئے ایک بحرِ بیکراں ہو، سورج کی روشنی ہو جس پر کوئی قید نہیں۔ یا پھر چار سُو پھیلی ہوئی ہوا ہو، جو کبھی تھمتی نہیں ہے۔

---

[۱] یہ مقالہ قلم قبیلہ بلوچستان کے افتتاحی اجلاس میں پڑھا گیا۔

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ہم سب عملی اور ذہنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان دونوں میں گہرا تعلق ہے اور ان کی صحیح مطابقت کے بغیر اچھے معاشرے کی تعمیر ممکن نہیں۔ ہر اختیاری عمل کے لئے فکر، سوچ اور خیال کی شرط مقدم ہے۔ ہماری فکری اور ذہنی زندگی کی تشکیل میں ادب کا بڑا حصّہ رہا ہے۔ اہلِ قلم اس زندگی کی بقا اور ارتقا کے لئے رُوحانی غذا بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔

آپ سب جانتے ہیں کہ معاشرہ محض مشینوں سے نہیں بنتا، وہ غیر ارتقائی اور بے جان نہیں ہے۔ معاشرہ ایک فعال، زندہ اور ارتقا پذیر ادارے کا نام ہے۔ اُس میں رہنے والے سُوجھ بُوجھ اور اپنی سوچ رکھتے ہیں اور ادیب و شاعر تو معاشرے کے سب سے زیادہ حسّاس اور با ضمیر افراد میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کے خیال کی وسعت اور بلندی خواہ کچھ ہو جائے ادب اپنی جڑوں یعنی معاشرے کے اثر سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اچھا ادیب اپنی تاریخ و ثقافت اور روایات کا نمائندہ بھی ہوتا ہے اور اس کا زائیدہ بھی۔ وہ کائنات اور زندگی کی تصویر ہی نہیں اُتارتا بلکہ اُس کی تشریح بھی کرتا ہے۔ اس لئے ہمارے معاشرے کو ادب اور ادیب کی عظمت و اہمیّت کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ اور اس طرح اپنے وقار کو بڑھانا چاہیئے۔

ادیب کا اہم فرض، صرف تصویرِ حیات پیش کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ اُس کی ذمّہ داریوں میں تصوّرِ حیات بخشنا بھی ہے۔ خلوصِ دل اور خونِ جگر کے بغیر معجزۂ فن کی نمود ممکن نہیں۔ ادیب کو معاشرے کی بھلائی اور ترقی کے لئے نیکی کا آئیڈیل اور اور اچھائی کے امکانات کا تصوّر تخلیق کرنا چاہیئے۔ تعمیری راستوں کی جانب نشان دہی کرنا چاہیئے۔

ادب کے بامقصد ہونے میں ہزارہا معنی چھپے ہوئے ہیں۔ چاہے کوئی ادبی تحریر، مزاح نگاری کے ذریعے بظاہر ہنسنے ہنسانے کا کام کرتی ہو، یا طنز کی معرفت، معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتی ہو، خواہ شاعری کے توسط سے جذبات کو اُبھارا جاتا ہو خواہ نثر

سے دعوتِ فکر دی جاتی ہو ۔ اور داستانوں سے لُطف اندوزی کا کام لیا جاتا ہو۔ ہر حال میں ادب پاکیزہ مقصد رکھتا ہے اور زندگی کو سنوارتے، بناتے اور آگے بڑھانے کی ذمّہ داری لیتا ہے۔

ادب کا مقصد محض وقت گزاری اور معمولی سی تفریحِ طبع ہرگز نہیں ہونا چاہیئے ۔ شاعروں اور ادیبوں کی بنیادی ذمّہ داری ہے کہ وہ معاشرے میں جوشِ حیات، مثبت اندازِ فکر اور اعلیٰ انسانی قدروں کو فروغ دیں ۔ ادب کو خود فراموشی اور فرار سے کوسوں دُور ہونا چاہیئے ۔

میرا خیال ہے کہ میں جن لوگوں سے اس وقت مخاطب ہوں خوب جانتے ہیں کہ عام طور پر ممالک اور ملّتیں کسی خاص مقصد ہی سے وجود میں آتے ہیں ۔ خود ہمارا ملک پاکستان نظریاتی وحدت کی بنا پر وجود میں آیا ہے ۔ یہ نظریاتی وحدت محض فضا میں پروان نہیں چڑھ سکتی ۔ اس کے لئے عملی اقدامات کرتے ہوں گے، اسے ذہن کو اس سے پوری طرح وابستہ کرنا ہوگا ۔ نظریاتی سرحدوں کی طرح جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت اور مضبوطی بھی ضروری ہے ۔ یہی حال، ادبِ عالیہ اور آفاقی ادبی قدروں کا ہے کہ وہ ہوا میں تحلیل ہو کر زندہ نہیں رہ سکتیں ان کو اپنی جڑوں کے لئے زمین درکار ہوگی اور یہ زمین قومی اور ملی شعور کی بیداری ہی سے پیدا ہوسکتی ہے ۔

معاشرے پر ادب کے اثرات معمولی نہیں غیر معمولی ہوتے ہیں۔ بالکل اس طرح جیسے ایک دوست کے اثرات دوسرے دوست پر ہوتے ہیں۔ ادب انسان کا دشمن نہیں ازلی وابدی دوست ہے ۔ وہ ایک ایسا دوست ہے جو مُلک میں قانون بنانے کی قوّت نہیں رکھتا، مذہبی مبلغ اور قومی لیڈر کا کام بھی انجام نہیں دے سکتا ۔ ادب، معالج اور جراح بھی نہیں کہ دوا یا جراحی سے لوگوں کو صحت بخشے، اور صوفی و ولی اللہ بھی نہیں کہ دُنیا کی تنقید سے بے نیاز رہے۔ بلکہ ادب ہمارا ایسا دوست ہے جو نہ ماضی سے ناطہ توڑتا ہے، نہ حال سے

بے خبر ہے اور نہ مستقبل سے بے پروا ہے۔ وہ ہمیں آن جانے اور نت نئے محبت کے راستوں میں لے جاتا ہے اور ہمارے دل و دماغ کو منور کرتا ہے۔ دُکھ سکھ میں ساتھ دیتا ہے، کوتاہیوں پر ٹوکتا ہے، اور مایوسی میں اُمید کے دیپ بھی جلاتا ہے۔ سب کو ہمدم کی طرح، ہاتھ میں ہاتھ دیئے، ترقی کی منزلوں کی طرف لے جاتا ہے۔

احمد ہمیش

امراؤ طارق اور امر بیل

اُمراؤ طارق ایک ایسا کہانی کار ہے، جو زندگی کے پیڑ پر چڑھی ہوئی امر بیل کو کاٹ رہا ہے۔ وہ زندگی کے حق میں موت کی نفی کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ موت زندگی کو مٹا دیتی ہے، وہ زندگی سے کمٹ منٹ کو اولین اہمیت دیتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے بلکہ دھیان سے دیکھتا ہے کہ موت زندگی کو کتنے حربوں سے مٹاتی ہے۔ اِنہیں حربوں میں سے ایک حربہ امر بیل ہے۔ جب کسی شاداب و گھنے پیڑ پر یہ امر بیل چڑھتی ہے تو عام دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتی یا نظر آتی بھی ہے تو وہ اُسے پہچان نہیں سکتے۔ وہ پیڑ اور امر بیل کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ مگر امراؤ طارق کو پیڑ اور امر بیل میں نہ صرف فرق نظر آتا ہے بلکہ وہ اپنی پوری توجہ پیڑ کو امر بیل سے مُکتی دلانے میں صرف کر رہا ہے۔

گو یہ تاثر امراؤ طارق کی ایک مختصر مگر اہم کہانی "بیری کا درخت" کے تفہیم سے قائم کیا گیا ہے۔ مگر سچ پوچھ دیکھا جائے تو طارق کی باقی تمام کہانیاں مجموعی تاثر کے مقابلہ میں، "بیری کا درخت" کے تاثر سے مختلف نہیں۔ آپ اسے طارق کا انفرادی موقف کہہ لیجئے، مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی کسی ادیب کے انفرادی موقف کو جاننے کی دلچسپی پڑھنے والوں کو نہیں ہوتی، اس پر ستم یہ کہ اُردو میں ابھی کہانی کی تنقید کا رواج نہیں۔ سو کسی کتاب اور خاص کر کسی افسانوی مجموعہ کے جلسۂ رُونمائی میں تو یہ توقع نہیں رکھی جاتی کہ اُسکی

تنقیدی قدر و قیمت متعین ہو گی بھی یا نہیں۔ اکثر رسمی باتیں ہوتی ہیں اور لوگ فقط صحافتی سطح پر ایک حد تک واقف ہو جاتے ہیں کہ فلاں افسانہ نگار کا فلاں افسانوی مجموعہ منظرِ عام پر آ گیا۔ ایسا نہیں ہوتا کہ افسانہ نگار اور اس کے افسانوی مجموعہ کے بارے میں کوئی کارآمد تجسس پیدا ہو۔

اس کے باوجود یہاں میری یہ کوشش ضرور ہو گی کہ میں امراؤ طارق کے فکشن سے متعلق اُس کے انفرادی موقف کو موضوع بناؤں تاکہ "بدن کا طواف" جیسے افسانوی مجموعہ کی تنقیدی قدر و قیمت کا تعین ہو سکے۔

امراؤ طارق نے اپنے افسانوی مجموعہ کا نام "بدن کا طواف" رکھا ہے۔ دراصل یہ طارق کا تصورِ حیات ہے۔ موجودہ عہد کے مادی نظام پر زندگی کی نئی حقیقتوں سے قربت کا تصور۔ ویسے زندگی کی حقیقتیں خواہ پرانی ہوں یا نئی، اُن کا مرکز بدن ہے۔ پہلے بھی بدن کو بھوک لگتی تھی اور آج بھی بدن ہی کو بھوک لگتی ہے۔ پہلے بھی بدن ہی ننگا تھا اور آج بھی بدن ہی ننگا ہے۔ پہلے بھی اشیاء کا واسطہ بدن ہی سے ہوتا تھا اور آج بھی اشیاء کا واسطہ بدن ہی سے ہوتا ہے۔ پہلے بھی بدن کا بدن سے ملنا اور بچھڑنا ایک حقیقت تھی اور آج بھی بدن کا بدن سے ملنا اور بچھڑنا ایک حقیقت ہے۔ پہلے بھی سارے دُکھ اور سارے سُکھ بدن کو ملتے تھے اور آج بھی سارے دُکھ اور سارے سُکھ بدن ہی کو ملتے ہیں۔ پہلے بھی بدن ہی کو موت آتی تھی اور آج بھی بدن ہی کو موت آتی ہے۔ گویا تمام حقیقتیں بدن کے گرد طواف کرتی تھیں اور آج بھی طواف کرتی ہیں۔ مگر جب ہم ان حقیقتوں سے قربت کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب قریب ہونے والے شخص کا ذاتی تجربہ ہوتا ہے، جس میں حقیقتیں در آتی ہیں۔ تب وہ انھیں اپنے طور پر محسوس کرتا ہے اور برتتا ہے۔

جی ہاں ... مگر اُردو فکشن کی تاریخ میں پہلی بار سعادت حسن منٹو نے بدن کی حقیقتوں کو محسوس کیا اور برتا تھا۔ گو یہ ایک طرح سے پریم چند کی آدرش

وادی حقیقت نگاری کی تجدید کی ایک صورت تھی۔ مگر اس سے بڑھ کر منٹو نے پریم چند کے بعد اُردو فکشن کے دو غلط رویوں کا انقطاع کیا۔ ایک رویہ تھا۔ سوڈو PSUEDO رومانوی افسانہ نگاری اور ناول نگاری کی ضعیف تفصیل کا۔ اور دوسرا رویہ اجتماعی شعور کے حوالہ سے فرمائشی موضوعات پہ ترقی پسندوں کی انفعالیت کا۔ منٹو نے ان دونوں رویوں کے خلاف اپنی فعال فردیت کی بنیاد رکھی۔ اور بڑے پیمانے پر اُس کی پہچان کرائی۔ اور رائیٹرز رائیٹر، کی حیثیت سے اپنے بعد آنے والے کہانی کاروں کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ کہانی کار پیدا کئے۔ اس تفصیل میں یہاں جانے کا وقت نہیں مگر مختصراً یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ منٹو کے بعد برصغیر ہند و پاک میں جدید نئی اُردو کہانی سے متعلق جن دو خاص رجحانات نے اُردو فکشن کی تاریخ میں جگہ لی ہے بلکہ اعتبار صداقت قائم کیا ہے، وہ ہیں علامتی و تجریدی حقیقت پسندی کے رجحانات۔ مگر ان کے بانی کون کون کہانی کار ہیں اگر میں ان کے نام کا حوالہ دوں تو ممکن ہے یہ بہتوں کے لئے خلافِ توقع ہو ہاں ایک صورت یہ ہے اور یہ زیادہ بہتر صورت ہے کہ ان نقادوں کے ناموں کا ذکر کرتا چلوں جو اُردو فکشن خاص کر نئے اُردو فکشن کی تنقید لکھ رہے ہیں۔ مثلاً بھارت میں آل احمد سرور، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، باقر مہدی، وارث علوی، شمیم حنفی، محبوب رحمٰن، عبدالمغنی، اور یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ اُردو فکشن کی نئی تنقید بھارت میں لکھی جارہی ہے مگر ہمارے ملک پاکستان میں فکشن کی نئی تنقید لکھنا تو کجا اسے مزاج میں شامل نہیں کیا گیا۔ ہاں دو چار لوگ فکشن کی تنقید کی خانہ پُری ضرور کر رہے ہیں۔ مثلاً محمود واجد، شہزاد منظر، اور اظہر نیاز۔ امریکی سکالر لنڈا وشنگ جب یہاں آئی تھی تو یہاں زیادہ تر اُسے شاعری کے نقاد وہ بھی اوسط درجے کے نقاد ملے۔ شاذ و نادر کوئی اس سے فکشن کے ناقد کی حیثیت سے ملا ہو۔ لہٰذا وہ یہاں سے بہت مایوس گئی۔ میں یہ سب کچھ اس لئے بتا رہا ہوں کہ یہاں فکشن کی

تنقید کے قحط کے کارن اہمیتوں کا تعین نہیں ہو پایا ہے۔ یہ بات نہیں کہ ہمارے ہاں قابلِ قدر کہانیاں نہیں لکھی جارہی ہیں۔ بلکہ یہاں تو یہ بتانے والا ہی مشکل سے ہی ملتا ہے کہ کون سی کہانی ادبی ہے اور کون سی غیر ادبی۔ ہاں سوڈو PSUEDO ادبی سرگرمیوں، ڈائجسٹوں اور ماس میڈیا کے مقداری وسائل کی گرم بازاری بہت ہے۔

پھر بھی ۱۹۷۰ کے بعد نئی اُردو کہانی میں قدرِ اظہار Expression value کے اعتبار سے کچھ خوش آئند تبدیلیاں ضرور آئی ہیں۔ اس طرح کہ مصنوعی لایعنیت اور لاواقعیت، بے ضرورت تجریدی فارمولیشن، صفات کے بے ضرورت استعمال، افعال کے دانستہ انقطاع، کھوکھلی ڈائیلاگ ڈرافٹنگ اور کمپاؤنڈ فریز۔ کو بڑی حد تک ترک کر دیا گیا ہے۔ اس کے بجائے قابلِ فہم معنویت اور ماجرائیت، ٹرانسپیرنٹ فارمولیشن، صفات و افعال کے متوازن استعمال، ٹھوس ڈائیلاگ ڈرافٹنگ اور واضح فریز کو اہمیت دی جارہی ہے۔ یہ تو رہا مسئلہ تکنیک کا، پر اس کے ساتھ ہی موضوع کی برتری اور بااثری کے حق میں مقلد Fossilized جدیدیت اور مصنوعی Fake ترقی پسندی سے بہ یک وقت انحراف کیا جارہا ہے۔ اس اجتہاد میں اُمراؤ طارق بھی پیش پیش ہیں۔ مثلاً اُن کی کہانی "بیری کا درخت" میں امربیل، بیری کے درخت کے زوال کا استعارہ ہے۔ بیری کا درخت، اپنے تحفظ کے لئے امربیل سے مدافعت نہیں کرپاتا۔ بس وہ ایک طرح کی انفعالی بے چارگی میں زندگی کا حق مانگتا ہے۔ اس کے برعکس نیم کا درخت، اپنے تحفظ کے معاملے پر اٹل ہے۔ امربیل، نیم کے درخت پر اس لئے نہیں چڑھ پاتی کہ نیم کا درخت اپنی جگہ فعال ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہُوا، نیم کے درخت کے فعال روّیہ کو اس قدر تحریک دیتا ہے کہ وہ بیری کے درخت کے اُوپر جھکنے لگتا ہے اس قدر کہ امربیل کیلئے ٹکنے کی جگہ نہیں رہ جاتی۔ اس طرح کہانی کا استعاراتی ٹریٹمنٹ میں نیم کے درخت کو مردکے مردانہ اوصاف کا استعارہ بنایا ہے، جو بیری کے درخت کو امربیل کے تباہ کن شکنجہ سے آزاد کراتا ہے۔ بیری کا درخت، عورت کے بدن کا استعارہ ہے۔ یُوں اس کہانی میں تین استعارے ہیں۔ امربیل، نیم کا درخت، اور بیری کا درخت۔ ان تینوں استعاروں کو برتنے کے عمل میں ماجرائیت کی ایک

رنج وہ ہے، جس میں ذکیہ اور اُس کے دوست کے تعلق کو استحکام دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ذکیہ کے بدن کو توانا اور زندگی بخش پناہ کی ضرورت ہے اور جہاں یہ پناہ مِل جاتی ہے وہیں کہانی اس جملہ پر ختم ہو جاتی ہے — امر بیل اب بیری کے درخت سے اُتر گئی تھی اور بیری حرکت کر رہی تھی"۔ میں نے کہا نا۔۔ کہ اُمراؤ طارق ایک ایسا کہانی کار ہے جو زندگی کے پیڑ پہ چڑھی ہوئی امر بیل کو کاٹ رہا ہے، بلکہ وہ "بدن کے طواف" میں شامل ہر کہانی میں کسی نہ کسی طور امر بیل کو کاٹنے کا کام کرتا ہے۔ یہی اُس کا انفرادی موقف ہے۔ مگر اس اعتبار صداقت۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (AUTHENTICITY) کو پڑھنے والوں پر واضح کرنے کے لئے نئی افسانوی تنقید کی بے حد ضرورت ہے۔

متین الرحمٰن مرتضیٰ

بھارتی صحافت پر ایک نظر

بھارت کی گذشتہ ۴۳ سال کی تاریخ کو ایشیاء میں جمہوریت کے سب سے بڑے تجربے کی روداد کے طور پر دیکھا اور پرکھا جاتا ہے اور مغرب اس تجربے کی کامیابی سے خاصا متاثر بھی ہے۔ پاکستان میں بھارت کی سیاست اور جمہوریت کے تجزیئے اور مطالعے کی کوئی منظم کوشش غیر سرکاری سطح پر نہیں ہوئی جو یقیناً ہونی چاہیئے۔ اب تک اس نوعیت کی کوشش نہ ہونے کے اسباب میں منجملہ دوسری باتوں کے یہ سبب بھی شامل ہے کہ دونوں ملکوں کے کشیدہ تعلقات اور سفارتی انقطاع کے طویل عرصوں کے باعث دونوں ملکوں میں معلومات اور علمی و تحقیقی کوششوں کے نتائج کے تبادلے کی کوئی صورت نہیں رہی۔ تقریباً پورے ایک عشرے تک دونوں ملکوں میں اخبارات کا تبادلہ بھی معطل رہا۔ ان حالات میں غیر سرکاری سطح پر بھارت میں ارتقا پذیر نئے سیاسی و عمرانی نظام زندگی کے غیر سرکاری مطالعے اور تجزیئے کے امکانات ہی معدوم رہے ہیں ۷۷ ۱۹ء کے انتخابات کے بعد بھارت میں جو سیاسی تبدیلی رونما ہوئی اس نے دونوں ملکوں کے تعلقات کی کشیدگی کو معتدل کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور اب دونوں ملکوں میں شہریوں کی آمد و رفت سے کچھ آسانی اور اس نوعیت کے مطالعے کے لیئے وسائل کی نمود ہوئی ہے ۔

کسی بھی ملک میں جمہوریت کے تجربے کی کامیابی کا انحصار محض جمہوریت کی بقا اور فروغ کی نیک خواہشات پر نہیں ہوتا بلکہ اس معاشرے میں جمہوریت کو قوت بخشنے والے اداروں کی کیفیت کار، جمہوریت کے لئے نیک خواہشات رکھنے والے سیاست کاروں اور جمہوری نظام کو سند جواز بخشنے والے باشعور شہریوں کے ان

اداروں کے بارے میں رویوں اور برتاؤ پر بھی ہوتا ہے۔ اگر جمہوری ادارے فروغ پا رہے ہیں تو توقع کی جاسکتی ہے کہ اس معاشرے میں جمہوریت چل سکے گی اور اگر ان اداروں کی نشوونما معطل ہے یا ان کی بنیادیں متزلزل ہیں تو جمہوریت کے کسی بہت روشن مستقبل کی امید عبث ہوگی۔

بھارتی روزناموں کی اشاعتیں اور اقتصادی بنیادیں

ایشیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا دعویٰ اور افتخار رکھنے والے اس ملک میں اخبارات کی اشاعت کا تناسب فی کس دنیا میں کمترین ہے۔ یہاں اشاعت کا اوسط فی کس ۰.۰۱۴ ہے (یعنی ۱۴ پرچے فی ہزار نفوس) جبکہ امریکہ و روس جیسے بڑے صنعتی ممالک میں اشاعت کا اوسط فی کس تقریباً ۰.۳ ہے یعنی ۳۰۰ پرچے فی ہزار نفوس)، پاکستان کی طرح بھارت میں اخبارات کی اشاعتوں کی تعداد محدود ہونے کے اسباب قابل فہم ہیں۔ پاکستان کی طرح کم شرح خواندگی اور پاکستان کے مقابلے میں انفرادی خاندان کی سطح پر افلاس کی شدت تو عمومی اسباب ہیں۔ زیادہ اشاعتیں رکھنے والے اخبارات میں جمود کی وجہ یہ ہے کہ اخبارات اپنے موجودہ اقتصادی وسائل کے ساتھ اپنی اشاعتوں کو مزید لامحدود طور پر بڑھانے کے متحمل نہیں ہیں کہ اخبار کی پیداواری لاگت اس کی قیمت فروخت سے زیادہ ہوتی ہے۔ شرح فروخت اور پیداواری لاگت کا یہ فرق اشتہارات سے ہونے والی آمدنی سے پورا ہوتا ہے اشتہارات کی آمدنی کے اضافے کا بہرحال ایک نقطۂ اختتام ہوتا ہے جو غیر صنعتی، ترقی پذیر اور محدود کاروباری سرگرمی والے ملکوں میں بہت جلد ہی درپیش ہوتا ہے۔ جب اخبارات کی اشاعت کی آمدنی جامد ہو جائے تو اخبارات کے لئے اپنی اشاعتوں کو اس آمدنی کی حدود پر روک دینا پڑتا ہے کیونکہ اس کے آگے خسارے کا میدان ہوتا ہے۔ اشاعت بڑھانے کے شوق میں اپنے لئے

[1] پریس ان انڈیا ۱۹۶۹ء دہلی ۱۹۶۹ء ص ۱۵۳ –

خسارے کی صورت اور دوسرے مسائل پیدا کر دینے کا تلخ تجربہ حال ہی میں بھارت کے بہت بڑے انگریزی روزنامے "ہندوستان ٹائمز" کو ہو چکا ہے جس نے اپنے ہمعصر انگریزی اخبار ٹائمز آف انڈیا کی سترہ روزہ ہڑتال سے فائدہ اٹھا کر اپنی اشاعت بہت زیادہ بڑھالی۔ اشاعت تو یقیناً بڑھی مگر پیداواری لاگت میں بھی اضافہ ہوا اور اخبار کو اس کی بھاری قیمت ۹۰ ہزار روپے یومیہ نقصان کی صورت میں ادا کرنی پڑی۔ گویا بھارت میں اخبارات کی اشاعتوں کے محدود ہونے کا سبب محض قارئین کی ناخواندگی اور ان کا افلاس ہی نہیں بلکہ اخبارات کی اشتہاری آمدنی کا محدود ہونا بھی ہے۔

اخبارات کے قارئین کا ارتکاز پاکستان کی طرح بھارت میں بھی شہری علاقوں میں ہے۔ بھارتی پریس کے اقتصادی پہلوؤں کا ایک تجزیہ اشوک وی ڈیسائی نے ۱۹۷۱ء میں کیا تھا جسے دہلی کے پریس انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا نے شائع کیا ہے۔ اس مطالعے میں اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے کہ بھارت میں اخبارات کی اشاعتیں محدود کیوں ہیں ڈیسائی نے تجزیے کے لیے دو نکات یہ متعین کئے (الف) بھارت میں اخبارات پڑھتا کون ہے؟ اور (ب) کیوں پڑھتا ہے؟ ان سوالات پر روشنی ڈالنے کے لئے ڈیسائی نے اپنے مقالے میں دہلی کے کپڑے کے ایک کارخانے کے زیر اہتمام ۱۹۶۶ء میں ہونے والے ایک مارکیٹ سروے کا حوالہ دیا ہے جس میں اخبار کے قارئین کی طبقاتی تقسیم کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اندراجات کے اس جائزے کے مطابق دہلی میں زیر جائزہ لوگوں میں ۹ء ۲۲ فیصد کاروباری اور پیشہ ور، ۷ء ۵۱ فیصد تنخواہ پانے والے ملازمین ۵ء ۱۶ فیصد محنت مزدوری کرنے والے ۰ء ۴ فیصد بیروزگار یا جائیدادوں کی آمدنی پر گذر بسر کرنے والے اور ۵ء ۲ فیصد ایسے لوگ تھے جنہوں نے اپنے سربراہ خاندان کا پیشہ ظاہر نہیں کیا۔ ان تمام طبقات کے لوگوں میں مجموعی طور پر ۳ء ۴۳ فیصد لوگ انگریزی اخبارات کے قارئین تھے اور ۵ء ۲۰ فیصد لوگ ہندی اخبارات پڑھتے ہیں۔ گویا مجموعی طور پر دہلی میں ۳ء ۵۵ فیصد لوگ اخبارات

لہ ماہنامہ "پروب / انڈیا" الہ آباد جنوری ۱۹۸۰ء ص ۱۹

کے قاری ہیں اور ۳۲ء۴۴ فیصد قارئین کا تعلق تنخواہ پانے والے ملازم پیشہ طبقے سے تھا۔ بقول ڈیسائی اس جائزے میں جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ دہلی میں اخبارات کے قارئین کا پورا طبقہ عملاً تنخواہ یافتہ ملازمین کاروبار کرنے والوں پیشہ وروں اور جائیداد رکھنے والے افراد پر مشتمل ہے۔ گویا اخبار بینی بالعموم اعلیٰ اور درمیانے طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کی عادت ہے۔ اخبار کے قارئین کے طور پر محنت مزدوری کرنے والے افراد زیادہ اہم نہیں ہیں۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اخبار بھارت کے سب سے متمول شہر میں بھی کم از کم عوامی ذریعہ ابلاغ نہیں ہے۔

شہری علاقوں میں اخبارات کی زیادہ کھپت کے اسباب محض یہی نہیں کہ شہروں میں قوت خرید اور شرح خواندگی دیہی علاقوں کی بہ نسبت زیادہ ہے بلکہ اس کے دوسرے عوامل میں شہروں میں اخبارات کے قارئین کی گنجان آبادی اور ان تک اخبارات پہنچانے کے مصارف کی کمی قابل ذکر ہیں۔ شہروں سے باہر اخبارات کی تقسیم میں ٹرانسپورٹ کے مصارف یقینی طور پر زیادہ آتے ہیں اور چونکہ صنعتی مصنوعات کی کھپت بھی بیشتر شہروں میں ہی ہوتی ہے اس لئے اخبارات کو اشتہارات بھی شہروں میں ان کی کثرت اشاعت ہی کی بنیاد پر ملتے ہیں۔ تیز رفتار نقل و حمل اور مواصلات کی سہولتیں بھی دیہی علاقے میں موجود نہیں ہوتیں لہٰذا اخبارات دیہات تک تیزی سے پہنچنے میں ریڈیو یا ٹیلی ویژن کی برق رفتاری کا مقابلہ نہیں کر سکتے کہ وہ ان کے مقابلے میں وہاں باسی محسوس ہوتے ہیں۔ ان اسباب کی بنا پر اخبارات کا دائرہ اشاعت محدود ہو جاتا ہے۔ گویا صورت یہ ہے کہ بھارت کے شہری علاقوں میں تو اخبارات پہنچتے ہیں اور پڑھے جاتے ہیں مگر دیہی علاقوں تک ان کی رسائی بھی محدود ہے اور قوت خرید کی کمی اور ناخواندگی کی شرح کی زیادتی کے سبب انہیں پڑھنے اور خریدنے والے بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مجموعی طور پر اشاعتوں کو محدود رکھنے والا ایک عامل اخباری کاغذ کی کمیابی بھی ہے۔ کاغذ کی ملکی پیداوار طلب کے مقابلے میں کم ہے لہٰذا بیرون ملک سے منگایا

لہ اشوک دی ڈیسائی، اکنامک آسپیکٹس آف دی انڈین پریس، پریس انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا نئی دہلی ۱۹۷۱ء ص ۲

جاتا ہے اور سرکاری اہتمام میں بقدر حصہ رسدی اخبارات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کے باعث اخبارات اپنی اشاعتیں لامحدود سطور پر بڑھا بھی نہیں سکتے۔

پچھلے تین عشروں میں بھارت میں روزناموں نے کافی ترقی کی ہے۔ ۱۹۵۲ء میں حکومت بھارت نے جو پریس کمیشن قائم کیا تھا۔ اس کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۵۲ء میں بھارت سے ۳۳۰ روزنامے نکلتے تھے اور ان کی کل اشاعت تقریباً سوا پچیس لاکھ تھی۔ انگریزی اخبارات کی کل تعداد ۴۱ تھی یعنی بھارت سے نکلنے والے روزناموں میں انگریزی اخبارات کا تناسب ۱۲٫۴۲ فیصد تھا مگر ان کی مجموعی اشاعت ۶ لاکھ ۹۷ ہزار تھی یعنی بہ اعتبار اشاعت انگریزی روزنامے بھارتی روزناموں کی کل اشاعت کا ۲۷٫۵۹ فیصد تھے۔ اس کے مقابلے میں ہندی اور اردو کے اخبارات بہ اعتبار تعداد بہت زیادہ مگر بہ لحاظ اشاعت پیچھے تھے۔ ہندی اور اردو کے روزناموں کی مجموعی تعداد ۱۴۶ تھی جو بھارت سے نکلنے والے روزناموں کا ۴۴٫۲۴ فیصد بنتے تھے مگر ان کی مجموعی اشاعت محض ۵ لاکھ ۹۲ ہزار یعنی بھارتی روزناموں کی کل اشاعت کا ۲۳٫۴۴ فیصد تھی[1] ۱۹۵۵ء تک چار سال میں روزانہ اخبارات کی تعداد ۳۴۰ ہوگئی یعنی ۱۰ کا اضافہ ہوا مگر اگلے دس برس میں یہ تعداد تقریباً دگنی ہوگئی۔ ۱۹۶۰ء میں روزناموں کی تعداد ۶۳۴ تھی[2] ۱۹۷۶ء تک روزناموں کی تعداد ۸۷۵ اور ان کی مجموعی اشاعت ۹۱ لاکھ ۵۴ ہزار ہوگئی[3]۔ روزناموں کی تعداد اور اشاعت میں ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۶ء تک جو تبدیلی ہوئی وہ ایک نظر میں یہ ہے۔

سال	روزناموں کی تعداد	روزناموں کی مجموعی اشاعت	اوسط اشاعت
۱۹۵۲ء	۳۳۰	۲۵۲۵۵۰۰	۷۶۵ تقریباً
۱۹۷۶ء	۸۷۵	۹۱۵۴۰۰۰	۱۰۴۶ تقریباً

---

[1] یہ اعداد و شمار "انڈیا ۱۹۵۵" کے صفحہ ۳۵۱ پر مندرج روزناموں کی تعداد و اشاعت سے متعلق گوشوارے سے ماخوذ ہیں۔ [2] اشوک وی ڈیسائی، متذکرہ، ص ۸

[3] پروب انڈیا، متذکرہ بحوالہ رپورٹ رجسٹرار اخبارات، ص ۷۔

دو سالوں کے ان اعداد و شمار کے موازنے سے ظاہر ہے کہ ۱۴ سالوں میں روزناموں کی تعداد کے مقابلے میں ان کی مجموعی اشاعت کی تعداد میں اضافہ زیادہ تیز رفتار رہا ہے جس سے اوسط اشاعت بڑھ گئی مگر اوسط اشاعت کا یہ اضافہ روزناموں کی تعداد میں اضافے کی طرح حوصلہ افزا نہیں رہا یعنی روزناموں کی تعداد میں تو ۱۶۵ فی صد اضافہ ہوا مگر ان کی اوسط اشاعت میں اضافہ محض ۷ء۳ فیصد رہا، البتہ مجموعی اشاعت کا اضافہ متناسب ہے یعنی تقریباً ۱۶۲ فیصد۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ۱۹۵۲ء تک انگریزی اخبارات اگرچہ تعداد میں کم تھے مگر ان کی اشاعت بھارتی روزناموں کی کل اشاعت کا ۵۹ء ۲۷ فیصد اور اُردو ہندی اخبارات تعداد کے لحاظ سے انگریزی روزناموں سے تین گنا سے بھی زائد تھے مگر ان کی اشاعت انگریزی اخبارات کی مجموعی اشاعت سے کم اور تمام بھارتی روزناموں کی مجموعی اشاعت کا ۱۴ء۲۳ فیصد تھی۔ صنعتی علاقوں کی زبانوں بنگالی، تامل، گجراتی اور مرہٹی میں نکلنے والے روزناموں کی تعداد ۸۰ مگر ان کی اشاعت بھارتی روزناموں کی کل اشاعت کا تقریباً ایک تہائی یعنی ۱۲ء ۳۱ فیصد تھی۔ ۱۹۵۲ء کے بعد انگریزی اور ہندی اخبارات کی اشاعتیں تو اسی اوسط شرح کے ساتھ بڑھیں جو دوسرے اخبارات کی رہی ہے مگر سب سے زیادہ تیز رفتار اضافہ جنوبی ہند کی زبانوں یعنی مرہٹی، کنّاڈا، ملیالم اور تامل کے اخبارات کی اشاعتوں میں ہوا۔ ان زبانوں کے اخبارات کی اشاعتوں میں ہونے والی تبدیلی ذیل کے گوشوارے میں دیکھی جا سکتی ہے۔

زبان	۱۹۵۲ء میں روزناموں کی کل اشاعت سے تناسب فیصد	۱۹۶۷ء میں روزناموں کی کل اشاعت سے تناسب فیصد
کنّاڈا	۲٫۸	۳٫۶
ملیالم	۷٫۷	۱۱٫۱
تامل	۶٫۶	۱۱٫۱
مرہٹی	۷٫۵	۸٫۹

سلہ انڈیا ۱۹۵۵ء متذکرہ بالا سے ماخوذ، ص ۳۵۱ سلہ اشوک، وی ڈیسائی، متذکرہ ص ۲۴-۲۳

اشاعتوں میں اس اضافے کے پس منظر میں ان زبانوں کے اخبارات کی یہ سوچی سمجھی حکمت عملی کار فرما رہی ہے کہ آمدنی کے لئے انگریزی اخبارات کے برعکس اشتہارات کی بجائے زیادہ سے زیادہ اشاعت پر انحصار کیا جائے اور اشاعتیں بڑھانے کے لئے انہوں نے اخبار کی ضخامت کم رکھی، اخبارات کو سستا بنایا اور سستے اخبار سے نفع کمانے کے لئے ہر ممکن کفایت اور بچت کی راہ اختیار کی اور انہیں زیادہ سے زیادہ قابل قبول بنانے کے لئے علاقائی خبروں پر زور دیا۔ ۱۹۶۰ء کے اعداد و شمار کے مطابق دیسی زبانوں کے اخبارات نے ۶۰ فیصد اخبارات کی فروخت اور ۴۴ فیصد اشتہارات سے کمایا اس کے برعکس انگریزی اخبارات نے ۲۰ فیصد اخبار کی فروخت اور ۶۵ فیصد اشتہارات سے کمایا[1]۔

بھارت میں اخبارات کی تعداد اشاعت کا تناسب فی کس تو دنیا کے ترقی یافتہ جمہوری ملکوں سے بہت کم ہے مگر اخبارات کی تعداد کا تناسب فی کس کچھ زیادہ کم نہیں۔ بھارت میں یہ تناسب ۰۰۱۱ء جبکہ برطانیہ میں ۰۰۱۹ء اور جاپان میں ۰۰۱۷ء ہے۔ بھارت میں جمہوریت کے صحت مندانہ ارتقاء کے لئے اخبارات کی تعداد میں اضافے کو ضروری سمجھا جاتا ہے[2]۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ چھوٹے اخبارات کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے سلسلے میں سرکاری سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔ انہیں سرکاری اشتہارات زیادہ ملتے ہیں۔ اشوک وی ڈیسائی کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق چھوٹے اخبارات کی اشتہارات کی کمائی میں ۴۱ فیصد حصہ سرکاری اشتہارات کا ہوتا ہے جبکہ درمیانے اور بڑے اخبارات کی اشتہارات کی کمائی کا ۱۰ فیصد سرکاری اشتہارات سے حاصل ہوتا ہے۔ اس سرکاری پالیسی کے نتیجے میں مضافاتی اور اضلاعی نیز چھوٹے اخبارات سیاسی طور پر حکومت کے زیر اثر رہتے ہیں۔ چھوٹے اخبارات اپنی بقا کے لئے وسائل کچھ دوسرے ذرائع سے بھی حاصل کرتے ہیں مثلاً جن چھوٹے اخبارات کے اپنے چھاپے

---

[1] اشوک وی ڈیسائی۔ متذکرہ ص ۲۴۔
[2] ″ ″ ص ۸۔

خانے ہیں وہ فرصت کے اوقات میں اجرت پر طباعت کا باہر کا کام بھی کرتے ہیں اور اس طرح اخبارات کا خسارہ طباعت کی اس کمائی سے کم ہو جاتا ہے جب سے اخباری کاغذ کی تقسیم پر سرکاری کنٹرول قائم ہوا ہے اس وقت سے چھوٹے اخبارات کے لئے سرکاری سرپرستی میں کمائی کی ایک اور سبیل پیدا ہو گئی ہے۔ چھوٹے اخبارات کی اشاعتوں کی پڑتال میں رجسٹرار اخبارات کی طرف سے چشم پوشی سے کام لیا جاتا ہے چنانچہ چھوٹے اخبارات اخباری کاغذ کے صناع اور نہ فروخت ہونے والے اخبارات کی ردی کے حوالوں کے تحت قانونی طور پر زیادہ اخباری کاغذ وصول کرتے ہیں اور کم استعمال کرتے ہیں بچ رہنے والے کاغذ کو بلیک میں فروخت کرکے بھاری نفع کماتے ہیں بارہ تیرہ سو روپے ٹن کے نرخ والا اخباری کاغذ بلیک میں دو ڈھائی ہزار روپے ٹن تک بک جاتا ہے[1]۔ ۱۹۷۲ء میں حکومت نے روزناموں کی اشاعتوں میں اضافے کے لئے اخباری کاغذ کا کوٹہ بڑھایا تو بڑے اخبارات کے کوٹے میں ڈھائی فیصد اور چھوٹے اخبارات کے کوٹے میں دس فیصد کا اضافہ کیا گیا[2]۔

اخباری کاغذ کی بلیک میں فروخت سے کمائی کا سلسلہ محض چھوٹے اخبارات تک محدود نہیں بلکہ بعض بڑے اور معروف اخبارات بھی یہ کام کرتے ہیں۔ بائیں بازو کا انگریزی روزنامہ "پیٹریاٹ" ۱۳ مارچ ۱۹۶۳ء کو جاری ہوا۔ دوسرے ہی برس اس کی اشاعت ۲۷ ہزار ہو گئی۔ اگرچہ بعد ازاں اس کی اشاعت صرف نو سے گیارہ ہزار تک رہ گئی مگر دستاویزی سطح پر اس اخبار کے پاس ۵۵ ہزار کی اشاعت کا لائسنس موجود رہا اور اسی حساب سے اخباری کاغذ کا کوٹہ وصول کرتا ہے اور جہازوں سے

---

[1] اشوک، دی ڈیلسائٹ۔ متذکرہ ص ۱۲

[2] ارن بھٹاچارجی، دی انڈین پریس، پروفیشن ٹو انڈسٹری، پریس انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا۔ دہلی ۱۹۷۲ء ص ۳۱۔

اخباری کاغذ کے اترتے ہی اپنی اصل ضرورت سے فاضل کاغذ بمبئی میں بلیک میں بیچ ڈالتا ہے[1]۔

چھوٹے اخبارات کی بقا کا ایک ذریعہ سیاسی جماعتوں کی اعانت اور سرپرستی بھی ہے ان میں خاص طور پر کمیونسٹ پارٹیاں قابل ذکر ہیں۔ بھارت میں ۵۰۰ سے زائد اخبارات اور جرائد کمیونسٹ پارٹیوں کی جانب سے شائع ہوتے ہیں چونکہ بھارت میں ایسا کوئی قانون نہیں تھا کہ جس کے تحت اخبارات کو اپنے مالی ذرائع منکشف کرنے پر مجبور کیا جا سکے۔ اس لئے بھارتی اخبارات پر بیرونی سرمائے کے اثرات کا صحیح اندازہ لگانا دشوار رہا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں منظور ہونے والی ایک ترمیم کے تحت پریس کونسل آف انڈیا کو اس پہلو کے بارے میں پوچھ گچھ کا اختیار حاصل ہو گیا ہے۔ یوں بھی بھارت میں کسی بھی اخبار کو کسی غیر ملک سے نقد انعام یا ایوارڈ حاصل کرنے کی اجازت ہے چنانچہ رقم اس بہانے بھی اخبارات تک پہنچ جاتی ہے اخبارات کو من حیث الادارہ ہی نہیں بلکہ انفرادی طور پر صحافیوں کو بھی بیرون ملک سے رقمیں وصول ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک بار کلکتہ پریس کلب کو ایک رکن نے توجہ دلائی کہ کچھ اخبارات کے چند صحافیوں کو ایک غیر ملکی مشن سے "اجرت ترجمہ" کے عنوان سے رقم ملتی ہے۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ یہ اخبارات دیسی زبانوں کے تھے اور انہیں انگریزی میں لکھے ہوئے مضامین فراہم کئے جاتے تھے جن کے ترجمے کی اجرت بھی ادا کی جاتی تھی[2]۔

۱۹۶۳ء میں جب بائیں بازو کے معروف بھارتی انگریزی روزنامے "پیٹریاٹ" کا اجراء ہوا تو اس کے لئے فنڈ فراہم کرنے والے ذرائع کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور ہوئیں۔ اس اخبار کے لئے باہر سے جو سرمایہ فراہم کیا گیا اس کے ذرائع

---

[1] ہ۔ر۔د۔ب / انڈیا متذکرہ ص ۴۴۔

[2] ارن بھٹاچارجی ص ۲۹۔

سوشلسٹ ملکوں کے اشتہارات تھے جو اس اخبار کو وافر ملتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ ان ملکوں کے سفارتخانے پیٹریاٹ کے پریس کو مختلف چیزیں چھاپنے کے آرڈرز بھی دیتے رہتے تھے[1] اور اس طرح بیرونی "جاب ورک" سے پیٹریاٹ کی آمدنی کا ایک قابل اعتماد ذریعہ پیدا کیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا بھی روزنامہ پیٹریاٹ اور ہفت روزہ "لنک" کی پشت پر رہی۔

بھٹاچارجی نے اپنی کتاب میں جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا بیرونی سفارتی ذرائع سے صحافیوں کو رشوت دینے کی کوشش کا ایک دلچسپ واقعہ بھی درج کیا ہے۔ کلکتہ میں کسی بیرونی مشن کی جانب سے ایک پریس کانفرنس طلب کی گئی چونکہ پریس کانفرنس کوئی ضروری اور اہم نہ تھی اس لئے صرف ایک بھارتی خبر رساں ایجنسی کا رپورٹر ہی پریس کانفرنس میں پہنچا۔ کانفرنس روم میں میز پر درجنوں دیواری گھڑیاں سجی ہوئی تھیں جو صحافیوں میں تقسیم کی جانی تھیں۔!

چھوٹے بڑے سب اخبارات کا سب سے اہم مالی سہارا اشتہارات ہیں۔ بھارت میں اخبارات کو ملنے والے اشتہارات کی کل مالیت کا اندازہ ۴۵ سے ۵۰ کروڑ روپے تک ہے۔ ۱۹۶۸ء میں بھارتی اخبارات نے پوسٹرز اور ہورڈنگ کی صورت میں ۷ کروڑ روپے کے اشتہارات وصول کئے۔ فلمی صنعت سے اخبارات کو ملنے والے اشتہارات کی مالیت ۴ کروڑ روپے تھی۔ سمعی اور بصری پبلسٹی کی نظامت کے ذریعے ملنے والے مرکزی حکومت کے اشتہارات کی مالیت صرف ۲۷ لاکھ روپے تھی البتہ سرکاری شعبے کے اداروں کے اشتہارات کی سالانہ مالیت تقریباً ۵ کروڑ روپے ہوتی ہے[2]۔

---

[1] پروب/انڈیا، متذکرہ ص ۲۳۔
[2] ارن بھٹاچارجی، متذکرہ ص ۴۳۔

آزادیٔ صحافت اور حکومت کا کردار

آزادی کے بعد بھارت میں جن اخبارات کو فوری طور پر بڑھاوا اور پذیرائی ملی وہ نیشلسٹ اخبارات تھے اور ان کی امتیازی خوبیاں آدرش پرستی، جذبۂ خدمت اور نصب العین کے لئے ہر ممکن ایثار پر ہمہ وقت آمادگی تھیں۔ ان کے مقابلے میں وہ اخبارات بھی تھے جو تحریک آزادی کے دوران میں انگریز پرست تھے اور اسی وجہ سے آزادی کے بعد پسند نہ کئے جاتے تھے مگر آزادی کے بعد سرمایہ دارانہ خطوط پر معاشرتی ارتقاء کے سبب ملک کے اقتصادی و عمرانی منظر پر کاروباری اور متمول طبقہ چھا گیا اور اس نے ان اقدار کو زک پہنچائی جن کی داغ بیل تحریکِ آزادی کے عرصے میں پڑی تھی۔ کچھ اخلاقی معیارات آزادی کے ابتدائی سالوں تک برقرار رہے مگر رفتہ رفتہ غلط رجحانات نمایاں ہونے لگے۔ سرمایہ دار اور صنعتکار طبقے نے اخبارات اور ذرائع ابلاغ پر اپنی گرفت مضبوط کرنی شروع کی۔ صحافت کے میدان میں اس طبقے کی سرگرمی سے اخبارات ایک پیشے سے ایک بار اثر صنعت کے مرحلے تک تو پہنچے۔ ان کی اداراتی ہیئت، تنظیم اور تکنیک میں انقلاب آیا اور نتیجۃً انفرادی کوشش سے محدود اور مختصر سی سرمایہ کاری سے کوئی اخبار نکال لینا خواب و خیال کی بات بن کر رہ گئی۔ اخبارات کے بجٹ اور نئے اخبارات نکالنے کے لیئے سرمایہ کاری ہزاروں سے کروڑوں روپے تک پہنچی۔ ان کی دفتری عمارتوں کی خستہ حالی اور پستی، پُر شکوہ اور عالی شان ایوانوں کا روپ دھار گئی۔ مگر اس تاب و توانائی کے باوجود آزادیٔ اظہار کی پرانی سرمستی اور گرمجوشی برقرار نہ رہ سکی۔ بھارت کے اخبارات کی آزادی اظہار آج مختلف نوعیت اور مختلف جہتوں سے پڑنے والے دباؤ سے مغلوب ہے۔ اخبارات کے اظہار رائے کی آزادی پر حکومت کا دباؤ بھی ہے۔ سرمائے اور صنعت کا بھی۔ پیشہ ورانہ رقابتوں کا بھی اور معاشرے کی عدم برداشت کا بھی۔

حکومت اور اخبارات کے تعلقات کی کیفیت بھارت میں ابتدائی دو ڈھائی عشروں میں یقیناً پاکستان کے مقابلے میں بہتر رہی ہے۔ اخبارات اور حکومت کے مابین کشیدگی کے مواقع بہت کم اور مختصر رہے ہیں مگر اس میں اخبار نویسوں کی جدوجہد سے زیادہ ان عشروں میں قائم رہنے والی حکومتوں کی نیک نیتی اور خوشدلی کا کردار اہم رہا ہے تاہم بھارت میں ابتدائی دو ڈھائی عشروں کی صحافتی بے خوفی کا کریڈٹ صحافیوں اور صحافتی اداروں کو دیا جاتا رہا ہے۔ بھارت کے اخبار نویس اور بھارتی اخبارات کے ناقدوں اور مبصروں کا رویہ پاکستان کے اخبارات اور صحافیوں کے بارے میں استہزا اور حقارت کا رہا ہے۔ ارن بھٹاچارجی نے اپنی کتاب انڈین پریس پروفیشن ٹو انڈسٹری میں جابجا پاکستانی صحافت کی بے چارگی کے حوالے اس طرح دیئے ہیں جس سے بھارتی صحافت کے بارے میں ان کا احساس تفاخر اور پاکستان کے پریس کے بارے میں پستی و حقارت کے جذبات بہت نمایاں نظر آتے ہیں مگر یہ کیفیت بھارت میں لکھی جانے والی اس وقت تک کی تحریروں میں ہے کہ جب تک بھارتی پریس کے لئے آزمائش کی گھڑی نہیں آئی تھی اور یہ آزمائش کا مرحلہ ۱۹۷۷ء سے قبل مسز اندرا گاندھی کا ہنگامی حالت کے نفاذ کا وہ اعلان تھا جس کے بعد بھارتی اخبارات کو ویسے ہی ابتلا سے دوچار ہونا پڑا جیسا پاکستان کو متعدد مواقع پر درپیش ہوا ہے۔ اس ابتلا کے بعد سے اپنی صحافتی تاریخ کی تابناکی پر بھارتی صحافیوں کا مان ٹوٹ چکا ہے کیونکہ اس حادثے کے اثرات و نتائج کی کیفیت پاکستان سے کچھ مختلف نہ تھی۔ اس دور ابتلا سے گذرنے کے بعد اس سے نمٹنے کے سلسلے میں بھارت کے اخبار نویس اور صحافتی اداروں کی اہلیت کے بارے میں خود ایک بھارتی اخبار نویس کی رائے قابل ذکر ہے۔

"پریس کی آزادی کا تذکرہ توجہ کو بعض بنیادی سوالات کی جانب مبذول کرتا ہے آزادی کس کے لئے؟ اور کس مقصد کے لئے؟ اس ملک میں

ایک وقت وہ تھا کہ جب راج گوپال اچاری کے بدنام ایکٹ اور کچھ ریاستی حکومتوں کی بدسلوکی کے باوجود پریس کی آزادی میں حکومت کی مداخلت محض ایک مفروضہ نظر آتی تھی۔ مگر ہنگامی حالت کے نفاذ نے یکا یک منظر ہی بدل ڈالا۔ اب یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہمارے ملک میں حکومتی مداخلت کے امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ بجز چند مستثنیات کے نہ مالکان اخبارات نے اور نہ ہی صحافیوں نے یہ ثابت کرکے دکھایا کہ اس زمانے میں وہ پریس کی آزادی کے لئے لڑنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ شوروغوغا اس وقت ہوا جب ہنگامی حالت کا اعلان واپس لے لیا گیا اور پھر مارچ ۱۹۷۷ء کے بعد بھی ہمارا پریس کتنا آزاد رہا ہے؟"[1]

بات صرف اتنی ہی نہیں کہ بھارت میں پریس کی آزادی کی قابل فخر روایات کا مان ٹوٹ گیا بلکہ اب بھارت میں اخبار نویسوں کے ذہن مستقبل کے بارے میں بھی وسوسوں سے خالی نہیں ہیں۔ چترنجن کے جس مضمون کا اقتباس اوپر پیش کیا گیا ہے اس کے اوپر پروب کے ایڈیٹر نے جو افتتاحی نوٹ لکھا ہے اس کا آغاز یوں ہوتا ہے:[2]

"درمیانی مدت کے انتخابات کے فوراً بعد اخبارات کو ایک بار پھر عوام کی آزادی اور اظہار رائے کی آزادی کے دفاع کے لئے اپنا کردار مؤثر طور پر ادا کرنے کا چیلنج درپیش ہوگا۔ ان سے پھر یہ مطالبہ ہوگا کہ وہ ان اقدار کو پامال کرنے والی قوتوں کی مزاحمت کریں کہ جن پر عوام متعدد عشروں تک عمل پیرا

---

[1] سی این، چترنجن، دی پریس ان انڈیا۔ پروب/انڈیا

[2] متذکرہ ص ۹ ۔

رہے ہیں مگر کیا اخبارات یہ کردار ادا کر سکتے ہیں اور اس دباؤ کو جھیل سکتے ؟

ہنگامی حالت سے قبل اور بعد میں ان کی کارکردگی قارئین میں ایسے کسی اعتماد کی تحریک نہیں پیدا کرتی کہ واقعی انہیں صحافیوں کی اگر ایسی کوئی دشوار صورت حال پھر پیش آگئی تو وہ اس سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ ہنگامی حالت کے دوران جس انداز سے بیشتر اخبارات نے اپنے اوپر عائد ہونے والی پابندیوں کے سلسلے میں اپنے ردعمل کا اظہار کیا اس سے یہ بات منکشف ہو گئی کہ ایسے صحافیوں کا ملک میں شدید قحط ہے جو کڑے وقت میں ترقی پسند انسانی معاشرے کی ایک ناگزیر ضرورت یعنی آزادیٔ اظہار کی حفاظت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں ـــــ"

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ابتدائی دو ڈھائی عشروں تک بھارت میں حکومت اور اخبارات کے تعلقات خوشگوار رہے ہیں۔ ستمبر ۱۹۵۲ء میں حکومت نے اخباری صنعت کے مفصل جائزے کے لئے ایک پریس کمیشن قائم کیا۔ پریس کمیشن کی اہم سفارشات کو ابتدائی خلاصے کی شکل میں حکومت نے ۲۶ جولائی ۱۹۵۴ء کو شائع کیا۔ تفصیلی رپورٹ بعد میں شائع ہوئی۔ پریس کمیشن کی ایک سفارش یہ تھی کہ ایک پریس رجسٹرار مقرر کیا جائے جو اخباری صنعت کے متعلق حقائق اور اعداد و شمار کی ترتیب اور تدوین کا ذمہ ٹھہرایا جائے۔ ہر اخبار اور جریدے کے لئے لازم قرار دیا گیا کہ وہ رجسٹرار کو کچھ گوشوارے باقاعدگی سے فراہم کرے جس میں اخبار میں سرمایہ کاری کے نظام اور اہم مناصب پر برسرکار افراد کے ناموں کی تفصیلات شامل ہوں۔ ملازمین، اخباری صنعت میں مطلوبہ سامان اور مال کے استعمال نیز ملکیت، انتظامیہ اور اخبار کی تعداد اشاعت میں ہونے والی تبدیلیوں سے متعلق معلومات پر مبنی گوشوارے بھی وقتاً فوقتاً داخل کرنا لازم قرار دیا گیا۔ رجسٹرار کے لئے یہ پابندی تجویز کی گئی کہ وہ اخباری صنعت کی کیفیت کار کے بارے میں ہر سال اپنی رپورٹ منظرِ عام پر لائے۔ حکومت نے یہ تجویز منظور کر لی [1] اور پریس رجسٹرار کا دفتر اس صنعت کے متعلق مفید معلومات کی فراہمی کے ادارے کے طور پر مسلسل کام کر رہا ہے۔ کمیشن نے ۲۶ رکنی ایک پریس کونسل کی تشکیل بھی تجویز کی جس کا چیئرمین ہائی کورٹ کا کوئی جج ہوگا جسے بھارت کے چیف جسٹس نامزد کریں گے۔ اس میں تیرہ ارکان عامل صحافیوں (بشمول مدیران اخبارات) میں سے اور باقی مالکان اخبارات، جامعات، علمی و ادبی ایجنسیوں وغیرہ میں سے نامزد کرنا طے پایا۔ پیشے سے تعلق رکھنے والے ارکان کے لئے یہ شرط رکھی گئی کہ ان کا علمی تجربہ کم از کم دس سال ہو۔ اس کونسل کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ اخبارات کو اپنی کارکردگی کے احتساب اور مواخذے کا ایسا ادارہ میسر آجائے جو حکومت کے کنٹرول

---

[1] انڈیا ۱۹۵۵ء مذکرہ ص ۳۵۱ اور ۳۵۴

سے آزاد ہو۔ حکومت نے اس کونسل کی تشکیل بھی منظور کر لی۔ ایک اور تجویز یہ تھی کہ اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن قائم کرکے اسے اخباری کاغذ کی درآمد کا کام تفویض کیا جائے۔ بھارت میں تیار ہونے والے اخباری کاغذ کی کل پیداوار بھی اسی کے حوالے کر دی جائے۔ اور وہ اندرون ملک پیدا ہونے والے کاغذ کو درآمدی کاغذ کے ساتھ ملا کر یکساں قیمتوں پر فروخت کرے۔ حکومت نے اس ادارے کی تشکیل بھی منظور کی۔ ؎

اخبارات کے بارے میں حکومت کی پالیسی کے کچھ اصول رہے ہیں جو صیغہ راز میں نہیں رکھے گئے۔ اول یہ کہ چھوٹے اخبارات کی حوصلہ افزائی کی جائے اور بڑوں کی حوصلہ شکنی دوم یہ کہ دیسی زبانوں کے اخبارات کی پشت پناہی کی جائے

ان مقاصد کی تکمیل کے لئے حکومت کے ہاتھ میں دو اہم حربے ہیں۔ اوّل اخباری کاغذ کے کوٹے کی تقسیم اور دوم سرکاری اشتہارات کی تقسیم۔ صورت یہ ہے کہ ۱۹۷۱ء تک بھارت میں استعمال ہونے والے اخباری کاغذ کا ۸۰ فیصد بیرون ملک سے درآمد ہوتا تھا۔ اور باقی بیس فیصد نیپا ملز میں تیار ہوتا ہے۔ یہ ملز بھی سرکاری ملکیت میں ہے۔ کس اخبار کو کتنا اخباری کاغذ ملنا چاہیئے اس کا تعین رجسٹرار پریس کی طرف سے ہوتا ہے۔ کاغذ کے کوٹے کے تعین کے اصول یہ ہیں کہ جن اخبارات کی اشاعت پندرہ ہزار سے کم ہے انہیں اپنی اشاعت پندرہ ہزار کی حد تک لانے کے لئے حسب ضرورت ان کے کوٹے میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ جن اخبارات کی اشاعت پچاس ہزار سے کم رہی ان کے لئے بھی تیزی کے ساتھ اضافے منظور کئے گئے۔ زائد اشاعت والے اخبارات کی جانب سے کوٹے میں اضافے کے مطالبات کی پذیرائی میں

؎ "انڈیا ۱۹۵۵" متذکرہ، ص ۲۵۵

سرد مہری روا رکھی گئی۔ کوٹے کی تشخیص اس مفروضے کی بنیاد پر کی گئی کہ جو اخبارات ۱۹۵۷ء میں دس صفحات پر شائع ہوتے تھے انہیں صفحات اس سے زائد نہ بڑھانے چاہییں۔ البتہ جو اخبارات دس صفحات سے کم پر شائع ہوتے ہیں انہیں صفحات کی تعداد تدریجاً دس تک بڑھانے کے لئے مطالبے پر کاغذ کا اضافی کوٹہ مل جاتا ہے [1]۔

بھارت میں کاغذ کے کوٹے کی تقسیم کی سرکاری پالیسی پر جس کا اعلان ہر سال ابتدا ہی میں کر دیا جاتا ہے، تنقید ہوتی رہتی ہے۔ خصوصاً "انڈین اینڈ ایسٹرن نیوز پیپر سوسائٹی اکثر و بیشتر معترض رہتی ہے۔ زیادہ کوٹہ فراہم نہ کرنے کی شکایت بھی عام ہے مگر ایسی شکایت کبھی سامنے نہیں آئی کہ حکومت نے کاغذ کے کوٹے کی فراہمی یا اس کے تعین کو اخبار کی پالیسی میں تبدیلی سے مشروط کیا ہو [2]۔

سرکاری اشتہارات کی تقسیم وہ دوسرا حربہ ہے جس سے حکومتیں اخبارات کو اپنی مرضی کا پابند بناتی ہیں۔ پاکستان میں مختلف ادوار میں یہ حربہ حکومتوں کی جانب سے بڑے تواتر کے ساتھ استعمال ہوتا رہا ہے بھارت بھی اس نوعیت کی شکایات سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ بھٹاچارجی کے بقول بھارت میں یہ مسئلہ سنگین صورت میں موجود ہے۔ ۱۹۵۳ء میں حکومت بمبئی نے مقامی حکام پر تنقید والے ایک مضمون کی اشاعت کی پاداش میں ٹائمز آف انڈیا کے اشتہارات بند کر دیئے تھے۔ مدراس کے ہفت روزہ سوتنترا کے سرکاری اشتہارات بھی اس قسم کے اسباب کی بنا پر کئی سال بند رہے۔ صوبہ بہار میں بھی دو اخبارات کے ساتھ یہی سلوک ہوا۔ مغربی بنگال، بہار اور مہاراشٹرا میں

---

[1] اشوک وی ڈیسائی، متذکرہ، ص ۴۲ بحوالہ پریس ان انڈیا ص ۲۸۲

[2] اڈرن بھٹاچارجی، متذکرہ ص ۲۱۔

اخبارات کو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۷ء کے درمیان سرکاری اشتہارات کے بند کردیئے جانے کی شکایات بالعموم رہی ہیں۔ مغربی بنگال میں کانگریس کے عہد حکومت میں کمیونسٹ اخبارات کو شکایت رہی کہ انہیں سرکاری اشتہارات نہیں دیئے جاتے۔ جب متحدہ محاذ برسراقتدار آیا تو مخالف اخبارات حکومت کے ہمنوا بن گئے اور انہیں سرکاری سرپرستی حاصل ہوگئی ۱۹۶۷ء میں سب سے کثیرالاشاعت اخبار امرت بازار پتریکا کو سرکاری اشتہارات کی بندش کی دھمکی دی گئی۔ [1]

۱۹۷۱ء میں دہلی کی انتظامیہ نے جن سنگھ پر تنقید کے جرم میں "پیٹریاٹ" اور "نیشنل ہیرالڈ" کے اشتہارات روک دیئے [2] اس طرح عملاً صورت یہ رہی ہے کہ مرکزی سطح پر تو حکومت نے اپنا چہرہ صاف رکھا اور اشتہارات کو حربے کے طور پر اخبارات کی آزادیٔ اظہار چھیننے کے لئے استعمال نہیں کیا تاکہ بین الاقوامی سطح پر بھارت کا جمہوری امیج برقرار رہے مگر ریاستی سطح پر حکومت نے اس حربے کو اخبارات کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کے لئے بہت منظم طور پر استعمال کیا۔ متعدد صورتوں میں اشتہارات کی آمدنی سے اخبارات کو محروم کرنے والی ریاستی حکومتیں کانگریس ہی کی تھیں جبکہ اسی زمانے میں مرکز میں بھی کانگریس ہی کی حکومت تھی۔ ایک ہی پارٹی کی مرکزی اور صوبائی سطحوں پر حکومتوں کے رویئے کا یہ فرق اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اشتہارات کو اخبارات کی آزادی پر اثر انداز ہونے کے لئے بطور حربہ استعمال نہ کرنا حکمران جماعت کی پالیسی نہیں تھی۔ ورنہ وہ اپنی صوبائی حکومتوں کو بھی ایسا کرنے سے روکتی البتہ مرکزی حکومت کے ذریعے

---

[1] ارن بھٹاچارجی، متذکرہ، ص ص ۲۳ - ۳۲

[2] ۔ اشوک۔ وی ڈیسائی، متذکرہ ص ۔ ۳۶

اس حربے کے استعمال میں تامل کا مطلب صرف اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ حکمران جماعت بین الاقوامی سطح پر بھارت کے جمہوری امیج کو بگاڑنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ گویا حکمت عملی کا تقاضہ تھا کسی اخلاقی اصول کی مخلصانہ پیروی نہیں۔

لیکن ۳۰ سال خوش اسلوبی سے گذار دینے کے بعد مرکزی حکومت بھی اپنا بھرم قائم نہ رکھ سکی اور ہنگامی حالت کے زمانۂ نفاذ میں مرکزی حکومت نے جو کچھ کیا اس نے اس پارٹی کی سابقہ تمام حکومتوں کی نیک نامی پر پانی پھیر دیا۔

ہنگامی حالت کے عرصے کا ذکر ہم بعد میں کریں گے اس سے قبل کچھ ایسے واقعات کا حوالہ دینا مناسب ہوگا کہ جن سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ مرکزی حکومت بہر حال اخبارات کی پالیسیوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور بعض اوقات مرکزی حکومت کی ہمنوائی میں اخبارات کی ہوا خیزی بھی ہوتی ہے۔

ٹائمز آف انڈیا بھارت کا بہت ممتاز اور اہم انگریزی روزنامہ ہے اسے اپنی عافیت اسی میں نظر آتی ہے کہ مرکزی حکومت سے اس کا کبھی اختلاف نہ ہو۔ پنڈت نہرو کے زمانے میں جب مرہٹی صوبے کا مطالبہ زوروں پر تھا اور ہزاروں لوگ روزانہ اس مطالبے کے حق میں گرفتار ہو رہے تھے تو ٹائمز آف انڈیا محض حکومت کی ہمنوائی میں اس تحریک کا مخالف تھا۔ اپنے اداریے میں اس اخبار نے مرہٹی صوبے کی تحریک کو "محض خودکشی کی حماقت" قرار دیا لیکن جب پنڈت نہرو اور چوان نے نوشتۂ دیوار پڑھ کر راتوں رات مہاشٹرا صوبے کا مطالبہ تسلیم کر لیا تو ٹائمز آف انڈیا نے فوراً حکومت کی حمایت میں قلابازی کھائی اور اس فیصلے کو "بروقت" "دانشمندانہ" اور "دور اندیشی" پر مبنی قرار دیا۔

ساتویں عشرے میں کمپنی لاکی خلاف ورزی کے سلسلے میں ٹائمز آف انڈیا سرکاری کنٹرول میں آ گیا اور اس کے مالی معاملات کی تحقیقات کے لئے ایک رکنی کمیشن قائم ہوا۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر ٹائمز آف انڈیا کے زیر سایہ ہی ایک اور اخبار اکنامک ٹائمز کے ایڈیٹر ہری ہرن ٹائمز آف انڈیا اور اس کے

سلسلے کے دوسرے اخبارات کے مالک شانتی پرشاد جین سے باغی ہو گئے، انہیں توقع تھی کہ یہ اخبارات کسی نو تشکیل ٹرسٹ کے حوالے کر دیے جائیں گے مگر دہلی کے حکومتی حلقوں نے بہت جلد ان پر یہ بات واضح کر دی کہ وہ ان اخبارات کے مالکوں کو ایک مقررہ حد سے زیادہ پریشان کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ اس اشارے میں بین السطور یہ بات پڑھی جا سکتی ہے کہ ٹائمز آف انڈیا کے خلاف کارروائی کا مقصد صرف مالکوں کو حکومت کے حق میں ہموار اور سازگار کرنا تھا اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

ہنگامی حالت کا اندھیرا

ہنگامی حالت کے زمانے میں ٹائمز آف انڈیا اور اس کے سلسلے کے دوسرے اخبارات پرجوش طور پر اندرا گاندھی کی حمایت کرتے رہے۔ "ویکلی" کے ایڈیٹر خشونت سنگھ اندرا کی حمایت میں سب سے پیش پیش تھے لیکن جیسے ہی جنتا پارٹی برسر اقتدار آئی تو ٹائمز آف انڈیا نے اپنی وفاداریاں بدلنے میں دیر نہیں لگائی۔ خشونت سنگھ اندرا کی محبت میں کچھ زیادہ ہی بے قابو ہو گئے اور جنتا پارٹی کے آنے کے بعد بھی اندرا کی حمایت ترک نہ کی۔ مالکان نے سردار صاحب کو حواسوں میں لانے کی کوشش کی لیکن جب وہ اندرا سے ترک وفا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو انہیں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ سردار صاحب کا کہنا ہے کہ انہیں مرارجی ڈیسائی کے کہنے پر ملازمت سے نکالا گیا۔ گویا سردار صاحب اس بات کی تصدیق کر رہے ہیں کہ ٹائمز آف انڈیا کے زنجیرے کے اخبارات مرکزی حکومت ہی کی مرضی کے پابند رہ سکتے ہیں۔

سردار صاحب کے اس اشارے کی صداقت حالیہ انتخابات کی مہم کے دوران ثابت ہو گئی کیونکہ جنتا حکومت کا مستقبل غیر یقینی دیکھ کر ٹائمز آف انڈیا کے سلسلے کے اخبارات نے طے شدہ پالیسی کے طور پر باہم اختلاف پیدا کر لیا۔ کچھ اخبارات

ندرا کے ہمنوا ہو گئے اور کچھ جنتا کے حامی رہے تاکہ جو بھی پارٹی برسراقتدار آئے اس سے معاملہ کرنے کا دروازہ کھلا ہے[1]

بھارت کا ایک اور بڑا معروف انگریزی اخبار "اسٹیٹسمین" ہے۔ یہ اخبار بعض بدعنوانیوں کا مرتکب ہوا۔ مثلاً جس روز صفحات زیادہ ہوتے تھے اور اخبار ردی کے بھاؤ اپنی ضخامت کے باعث اپنی اصل قیمت سے زیادہ میں بک سکتا تھا تو اخبار کی انتظامیہ زیادہ اخبار چھپوا کر بازار میں لائے بغیر ردی کے بھاؤ بیچ دیتی تھی اور بھاری نفع کماتی تھی۔ ایسی ہی شکایت موصول ہونے پر اس کے خلاف تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی اور اس تحقیقات سے بدعنوانی ثابت ہو گئی اور اخبار کو اظہار وجوہ کا نوٹس جاری ہو گیا کہ کیوں نہ اس کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں ایک سرکاری ڈائریکٹر شامل کر دیا جائے مگر اخبار کی انتظامیہ نے مغربی بنگال کے وزیر اعلےٰ سدھارتھ شنکر رائے کے ذریعے اندرا گاندھی سے رابطہ پیدا کر لیا۔ اسٹیٹسمین کی انتظامیہ نے اندرا گاندھی کو خوش کرنے کی یہ تدبیر کی کہ اپنے ہی اخبار کے اسٹاف فوٹو گرافر رگھو رائے کی بنائی ہوئی اندرا گاندھی کی تصویروں پر مبنی ایک ایسے پرچے کا خصوصی شمارہ نکالا کہ جس میں خود اسٹیٹسمین کا بھی حصہ تھا[2]

ہندوستان ٹائمز بھارت کا بڑی عظیم قومی روایات والا اخبار شمار ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی ہنگامی حالت کے عہد تاریک میں بڑے شرمناک انداز میں سرنگوں ہو گیا ہنگامی حالت کے زمانے میں روزانہ اس اخبار کے صفحات پر کانگریس پارٹی اور اس کی حکومت کو نمایاں اہمیت دی جاتی رہی اور عملاً اس نے دوسری پارٹیوں کے اختلافی بیانات کا بلیک آؤٹ کیا۔ سابق وزیر دفاع بنسی لال جب اپنے

---

[1] بروب/ انڈیا، متذکرہ ص ۱۴

[2] 〃 〃 〃 ص ۱۵

شہر بھوانی آئے تو اس اخبار نے ان کے دورے کی خبروں کے حصول کا خصوصی اہتمام کیا۔ ایک روز صفحہ اول پر بنسی لال کی اپنے والد کے ساتھ بہت بڑی تصویر شائع کی۔ اس نے سنجے گاندھی کے پنج نکاتی پروگرام کی خوب تشہیر کی اور دو اداریوں میں سنجے کو بھارت کا نجات دہندہ اور گری بالڈی قرار دیا۔ طرفہ یہ ہے کہ جیسے ہی جنتا پارٹی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی یہ اخبار اندرا گاندھی اور سنجے گاندھی کی مخالفت میں سب پر سبقت لے گیا۔ [1]

"انڈین ایکسپریس" بھارت کے روزناموں میں سب سے زیادہ اشاعت رکھنے والا اخبار ہے۔ ہنگامی حالت کے زمانے میں اس کی احتیاط پسندی کا یہ عالم تھا کہ پہلا بڑا اخبار تھا جس نے بھارت کی شخصیات اور مسائل پر سنجے گاندھی کے خیالات کو اہمیت دینا شروع کی سنجے گاندھی کے شناسا ایک نامہ نگار کو اخبار کی طرف سے یہ ذمہ داری تفویض کی گئی کہ سنجے کے منہ سے نکلنے والے ہر لفظ کو اور اس سرگرمی کی تمام تفصیلات کو اخبار محفوظ کرے اور رپورٹ کرے۔

ان سب واقعات سے ظاہر ہے کہ مرکزی حکومت خواہ کانگریس کی ہو یا جنتا کی۔ تمام بڑے اخبارات کی پالیسی پر اثر انداز ضرور رہتی ہے خواہ پیش منظر میں وہ اخبارات کے معاملات سے کیسی ہی دور اور لاتعلق رہ کر ان کے معاملات میں دخیل نہ ہونے کا معصومانہ تاثر دیتی ہو۔

بھارت میں صحافت کے کوائف کی یہ عمومی تصویر ہے۔ اس تصویر کے بہت سے نقش خام ہیں۔ بہت سے پہلو تشنہ ہیں اور مزید کرید اور معلومات چاہتے ہیں جو سر دست مہیا نہیں۔ بھارت کی اخباری صنعت کی موجودہ کیفیت ایسی ہے کہ جس سے خود بھارت کے سنجیدہ حلقے مطمئن نہیں ہیں۔ یہ صورت حال اپنی خامیاں خود ظاہر کر رہی ہے۔ ہمارے کسی تبصرے کی چنداں ضرورت نہیں بھارت کے اندیشوں میں مبتلا صحافیوں کی طرح ہم بھی یہ دیکھنے کے منتظر ہیں کہ اندرا گاندھی کے دوبارہ برسر اقتدار آنے کے بعد صحافت پر کیا کچھ مزید بیتے گا

---

[1] بھروپ انڈیا، متذکرہ ص ۱۰

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

ڈاکٹر محمود حسین، اور جامعہ تعلیم ملّی ملیر

ایک اِدارہ ایک تحریک

ڈاکٹر محمود حسین ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر یوسف حسین، تینوں حقیقی بھائی تھے اور تینوں نے جو علمی و ادبی اور ملّی خدمات انجام دی ہیں وہ ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ ڈاکٹر محمود حسین، سب سے چھوٹے تھے اور شروع ہی سے تحریکِ پاکستان میں عملاً شریک رہے، پاکستان بننے کے بعد یہیں رہے بسے اور یہیں، جامعۂ ملّیہ ملیر کے احاطے میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمود حسین کے اوصاف، ایک دو نہیں درجنوں ہیں۔ وہ ایک ماہرِ تعلیم، بلند پایہ مُعلّم، مُستند مُورّخ، قابلِ قدر مصنّف، اور بہت اچھے منتظم تھے۔ شخصی اور انسانی حیثیت سے وہ فی الواقع بڑے آدمی تھے۔ ان کا اخلاق و کردار، قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں جیسا تھا اور ہمارے مُلک میں سو پچاس آدمی بھی اس اخلاق و کردار اور علم و فضل کے پیدا ہو جائیں تو قوم کی تقدیر بدل سکتی ہے۔

ڈاکٹر محمود حسین کو تعلیم، تعلیمی اداروں اور تعلیمی مسائل سے خاص دلچسپی تھی اُن کا یقین تھا کہ تعلیمی ادارے ہی ایک باکردار قوم کی تعمیر و تشکیل کا حق ادا کر سکتے ہیں چنانچہ اُن کی عملی پوری زندگی تعلیم ہی کے شعبوں میں گذری، مختلف یونیورسٹیوں میں پروفیسر رہے، کابینہ میں وزیرِ تعلیم رہے، وائس چانسلر رہے، اور درجنوں تعلیمی اداروں کے رکن و معاون رہے اسی کے ساتھ ساتھ جامعۂ تعلیم ملّی کے نام سے ایک مثالی تعلیمی ادارے کی بُنیاد ڈالی یہ ادارہ ابتدائی اسکول سے لے کر ڈگری کالج تک، ہر قسم کی فنی و سائنسی

تعلیم دیتا ہے اور کسی وقت پاکستان کے ان اداروں میں شمار ہوتا تھا جسے دیکھنے کے لئے دُور دُور سے لوگ آتے تھے اور جس میں داخلے کے لئے مُلک اور ملک سے باہر کے طلباء مشتاق رہتے تھے۔ اس ادارے کی شادابی اور چہل پہل فی الواقع دیکھنے کے لائق ہوتی تھی لیکن سرکاری تحویل میں جانے کے بعد، اب یہ ایک وحشت کدہ ہے، ہر طرف دُھول اُڑتی ہے اور بھیانک سناٹا ہے کاش، حکومت یا قوم اس طرف توجہ کرے کیونکہ ابھی اس کی جڑوں میں تازگی و توانائی باقی ہے اور ذرا سی آبیاری کے بعد یہ اب بھی ایک سایہ دار تناور درخت بن سکتا ہے۔

جامعہ ملیہ ملیر، کیسے قائم ہوا، اس کے بارے میں لوگوں کو پوری واقفیت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ مجلسِ تعلیم ملی کی سالانہ مطبوعہ روئدادیں بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں اس لئے اس کا مختصر تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مجلسِ تعلیم ملی (رجسٹرڈ) نام ہے ایک انجمن یا تنظیم کا اور جامعہ ملیہ نام ہے اس تعلیمی ادارے کا جو اس مجلس کے تحت قائم ہوا۔ مجلسِ تعلیم ملی کی جانب سے ۱۷ مارچ ۱۹۵۳ء کو جو میمورنڈم چھپا تھا اور جسے بعض ترمیمات کے ساتھ ٹائمس پریس کراچی سے بھی ۱۹۷۴ء میں شائع کیا گیا تھا۔ اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے بعض قدیم طلباء، اساتذہ اور بہی خواہوں کا ایک جلسہ ۷ مارچ ۴۸ء کو ہوا تھا، اسی میں مجلسِ تعلیم ملی پاکستان کے قیام کی قرارداد منظور کی گئی تھی۔ پھر ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو اس کا میمورنڈم مُرتب کیا گیا اور مولانا اسلم جے راج پوری، پروفیسر وقار عظیم، سید عروج الحسن، عبدالواحد سندھی، رحیم الدین، تصویر حسین اور کے۔ جی چشتی نے اس پر دستخط کئے لیکن یہ مجلس کئی برس تک صرف کاغذ پر رہی اور عملی صورت اختیار نہ کر سکی۔ جب ماسٹر عبدالحئی مرحوم اور اُس وقت کے وزیرِ تعلیم ڈاکٹر محمود حسین مرحوم، اس میں عملاً شریک ہوئے تو مجلسِ تعلیم ملی ایک فعال تنظیم بن گئی اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کی قیادت میں ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو "جامعہ ملیہ ملیر" کے نام سے اپنے وجود و اقدام کا عملی ثبوت فراہم کر سکی۔ چنانچہ مجلسِ تعلیم ملی کا یومِ تاسیس اسی نسبت سے ۲۹ اکتوبر کو منایا جاتا ہے اس تاریخ کے انتخاب میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی بنیاد بھی اسی تاریخ کو رکھی گئی تھی۔

جامعہ ملیہ [illegible] ایک بے خبر ہیں۔ جامعہ، مارچ ۱۹۵۲ء

کے سارے اخبارات میں اور' اپریل ۵۲ ۱۹ء کے نگار کے علاوہ جون ۱۹۶۶ء کے نگار میں بھی اس کا ذکر آچکا ہے۔ اکتوبر ۵۲ ۱۹ء میں جس وقت مجلسِ تعلیمِ ملّی کو جامعۂ ملیہ کے لئے موجودہ جگہ الاٹ ہوئی تو وہاں چند کمروں کی وہ لمبی بیرک موجود تھی جس میں جامعہ ملیہ کا ابتدائی مدرسہ ہے۔ یہ گروکل بلڈنگ نام کی ایک متروکہ عمارت تھی اور جامعۂ ملیہ سے پہلے اس میں "ری پبلک اسکول" کے نام سے آٹھویں جماعت تک ایک اسکول ۵۰ ۱۹ء سے قائم تھا۔ طلبار کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب تھی۔ چھ اُستاد تھے۔ پہلے ہیڈ ماسٹر مقبول احمد مرحوم اور دوسرے ہیڈ ماسٹر ذاکر حسین صبا لکھنوی تھے یہ اسکول " انجمنِ تعلیماتِ ملیہ" (رجسٹرڈ) کے تحت قائم تھا اور انجمن کے صدر مُلک کے ممتاز صنعت کار اور علم دوست جناب پیر محفوظ علی صاحب تھے اس کی مجلسِ منتظمہ میں مولانا سعید الرحمٰن رہبر کانپوری' رشید احمد رومی' عبدالعزیز جعفری اور ریاض الحق وغیرہ کے ساتھ راقم الحروف بھی شعبۂ نشر و اشاعت کے انچارج رکن کی حیثیت سے شامل تھا۔ نظامتِ تعلیم کی طرف سے اسکول کے معائنے بھی ہوئے لیکن چونکہ اسکول کی عمارت کے دو کمروں میں مولانا رضی صاحب مع خاندان کے رہتے تھے اور کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہ تھے اس لئے نہ تو پوری عمارت انجمن کی تحویل میں آسکی اور نہ اسکول کو سرکاری امداد مل سکی۔ مالی خستگی کو دُور کرنے کے لئے یہ طے پایا کہ ایک بین المملکتی مشاعرہ منعقد کیا جائے اس مشاعرے کا کنوینر اور اس کی انتظامی کمیٹی کا سیکریٹری بھی راقم الحروف تھا۔ ۸ مارچ ۱۹۵۲ء کو سندھ مدرسہ کے احاطے میں مشاعرہ ہوا۔ میری گذارش پر علامہ نیاز فتح پوری صدارت کے لئے اور جوش' فراق' جگر' اثر لکھنوی اور شعری بھوپالی مہمان شاعر کی حیثیت میں ہندوستان سے تشریف لائے۔ حفیظ جالندھری صاحب نے استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین کی حیثیت سے باہر سے آنے والے شعرار کا خیر مقدم کیا اور ضیار الحسن موسوی صاحب نے اسٹیج سیکریٹری کے فرائض انجام دیئے۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا ایک غیر معمولی مشاعرہ تھا۔ اس میں اس وقت کے بیشتر مرکزی وزرا شریک ہوئے تھے۔ سیّد ہاشم رضا صاحب کراچی کے ناظمِ اعلیٰ تھے اور ہندوستانی شعرار کے لئے اجازت نامے اُنہیں کے ذریعے حاصل کئے گئے تھے دوسرے دن شعرار کے اعزاز میں' پیر محفوظ علی صاحب نے اپنے گھر پر جو عشائیہ دیا تھا اس میں بھی سیّد ہاشم رضا صاحب'

حفیظؔ جالندھری صاحب اور ذوالفقار علی بخاری صاحب شریک تھے۔ لیکن مشاعرہ جس غرض سے کیا گیا تھا وہ مقصد پورا نہ ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ڈاکٹر محمود حسین صاحب مرحوم وزیرِ تعلیم تھے اور جامعۂ ملیہ کے قیام کے لئے جگہ کی تلاش میں تھے۔ سیّد ہاشم رضا صاحب کے توسط سے انہوں نے انجمن تعلیمات ملیر کے صدر پیر محفوظ علی صاحب سے بات چیت کی اور اس خیال سے کہ ملیر میں بہت جلد ایک مثالی تعلیمی ادارہ قائم ہو جائے گا پیر محفوظ صاحب نے ری پبلک اسکول کی عمارت کو مجلسِ تعلیمِ ملّی کی تحویل میں دے دیا۔ بعد کو مولانا رضی نے بھی کمرے خالی کر دیئے۔ اور مجلس نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۲ء سے اپنے انداز پر کام کرنا شروع کر دیا۔ چند برسوں میں، اس مجلس نے "جامعۂ تعلیمِ ملّی" کے نام سے ایک کثیر المقاصد تعلیمی درسگاہ قائم کر دی۔ ایسی درسگاہ جس کے معیار و تنظیم کی شہرت، ملک سے باہر دُور دُور تک پہنچ گئی تھی۔ اور جسے مثالی درسگاہ کے طور پر باہر کے ماہرینِ تعلیم کو دکھایا جاتا تھا۔ یونیورسٹی کا منصب ملنے ہی والا تھا کہ اُسے قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ اور سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ کئے دھرے پر پانی پھر گیا۔

احمد نہال

شام کا دُھواں

بچپن سے جوانی تک کا سفر یوں لہکتا مہکتا گزر گیا کہ مجھے احساس ہی نہ ہو سکا۔ لیکن جب بچپن کی معصوم کلی جیسی محبت پروان چڑھ کر شگفتہ پھول بنی۔ تو اچانک زندگی کے شاداب چمن میں خزاں آگئی ۔ وہ میری زندگی کی ساری شادابی اور مسرت سمیٹ کر سرحد پار چلی گئی۔ اور میں زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا تا رہ گیا۔

اُس کی الوداعیہ نگاہوں میں ایک خاموش محبت اور یقین کا پیغام پوشیدہ تھا۔ —— "مجھے بھولو گے تو نہیں ۔ اپنانے آؤ گے نا ۔ میں ساری عمر تمہارا انتظار کروں گی" ——

اور پھر اُس کے دل کا کرب آنسو بن کر عیاں ہو گئے اور وہ اپنے والدین کے ہمراہ پاکستان چلی گئی اور مجھے یوں لگا ۔ جیسے میری دودھیا بادل جیسی زندگی پہ درد وغم کا کثیف دُھواں پھیل گیا ہو اور پھر یہ دُھواں بڑھتے بڑھتے میری پوری زندگی پر چھا گیا اور میں اندھیرے میں ڈوب گیا ۔ ماضی کی حسین و سنہری یادیں ایک ایک کر کے بکھر گئیں ۔ اور میری انجم زندگی کی بھیڑ میں نجانے کہاں کھو گئی کچھ عرصے تک خطوط کا سلسلہ قائم رہا پھر منقطع ہو گیا کیونکہ دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی کی فضا چھا گئی تھی اور جنگ کے ہولناک بادل منڈلانے لگے تھے ۔ آمد و رفت، رسل و رسائل کے تمامی سلسلے مفقود ہو گئے تھے مجھے کچھ پتہ نہ چل سکا کہ میری انجو کس حال میں ہے۔ میں انتظار کے کرب آگیں لمحات میں جُھلستا رہا ۔ یادیں ہی اب میرے لئے سرمایۂ حیات تھیں ۔

لمحے تیزی سے گزرتے گئے ۔ راہیں کُھلتی گئیں ۔ پھر دونوں ملکوں کے درمیان خوشگوار سفارتی بحال ہو گئے اور پاسپورٹ و ویزا کی سہولتیں بحال کر دی گئیں ۔ ہزارہا لوگ ادھر سے اُدھر آنے جانے لگے ۔

اور پھر مجھے ایک دن یہ خوش خبری سُننے کو ملی کہ میری انجم اپنے والدین کے ہمراہ ہندوستان آرہی ہے۔ میرے دل میں مسرت و شادمانی کی لہریں بکھر گئیں اور سارا عالم بہار آفریں نظر آنے لگا۔

پھر انتظار کے بوجھل دن ختم ہوئے اور اُمید کی پُربہار صبح آگئی۔ مجھے معلوم ہوا کہ میری انجو اپنے عزیز کے یہاں آگئی ہے۔ میری اُداس زندگی میں آشاؤں کے جگنو چمک اُٹھے۔ اور میں ہزار ہا اُمنگوں اور بیکراں تمناؤں کے ساتھ انجم سے ملا تو اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ستارے لرزاں تھے میں ایک لمحہ کے لئے بیچین ہو اُٹھا۔

— "میری انجو! تم رو کیوں رہی ہو؟ آج تو مسرت و شادمانی کا دن ہے۔"

"میرے نوید — ! دل جب خوشیوں سے لبریز ہو جاتا ہے۔ تو مسرت کے موتی آنسو بن کر چمک اُٹھتے ہیں"۔ وہ جذبات میں ڈوب کر بولی۔

"ہاں انجو — ! لیکن اب یہ خوشیاں دائمی بن جائیں گی۔ پھر ہم لوگ جُدائی کی آگ میں نہ جلیں گے۔"

"ایسا ہی ہوگا نوید۔ ہم جلد ہی ایک دوسرے کے ہو جائیں۔ ممی تمہیں پسند کرتی ہیں"۔ اور یہ کہتے ہوتے وہ شرما گئی۔ پھر ہم لوگ کافی دیر تک ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں سُنتے رہے۔ ہزار ہا باتیں، بچپن کی معصوم شرارتوں سے لے کر جُدائی کی بوجھل گھڑیوں کی داستان ایک دوسرے کو سُناتے رہے۔ اور وقت دبے پاؤں گزرتا چلا گیا۔ اور جب میں رخصت ہونے لگا تو انجو نے مجھے دو "شعری مجموعے" پیش کئے۔ "یہ میں تمہارے لئے لائی ہوں"۔ وہ مُسکراتے ہوئے بولی۔

میں نے مجموعے دیکھے یہ میرے انتہائی پسندیدہ پاکستانی قلم کاروں کے بہترین انتخاب تھے۔ میں بہت خوش ہوا۔

"میری انجو — ! تم اور تمہارا دیا ہوا تُحفہ مجھے دونوں عزیز رہیں گے"۔ میں محبت سے سرشار ہو کر بولا اور پھر چلا آیا۔

میری زندگی کا ایک ایک لمحہ کیف و نشاط میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہماری ملاقاتیں رنگین اور

باتیں خوابناک ہونے لگیں ۔ ہر شے پر مسرت کی لالی بکھری ہوئی دکھائی دیتی ۔ میرے جسم کے تار و پود میں رعنائیاں اور نکہتیں سمائی ہوئی تھیں ۔۔۔

ایک ایسی ہی مسرت آفریں شام تھی ۔ انجم میرے سامنے بیٹھی تھی ۔ وہ شفق آگیں عارض جو ہمیشہ مجھ سے ملتے وقت کھل اُٹھتے تھے ۔ آج مجھے مرجھائے ہوئے معلوم ہوئے اور آنکھوں کی پلکوں پر نمی سی محسوس ہوئی ۔ میں تڑپ اُٹھا ۔

" کیا ہوا انجم ۔ ! تم اُداس کیوں ہو ؟ اتنا کہتے ہی اُس کی آنکھیں ساون بھادوں کی برکھا بن گئیں ۔

" میرے نوید ۔ ! تم سے ملنے کی ساری آرزوئیں اور تمنائیں ایک سراب ثابت ہوئیں جو کچھ ہم نے سوچا تھا وہ ایک خواب کے سوا کچھ نہیں ۔ مجھے بھول جاؤ ۔ میں تمہاری نہ بن سکوں گی کیونکہ میرے ماموں راضی نہیں ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ نوید ایک معمولی کلرک ہے ۔ وہ زندگی کی وہ تمام آسائشیں نہ دے سکے گا جو ایک خوبصورت اور اچھی زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہیں ۔ اور وہ میرا رشتہ شکیب سے کر رہے ہیں اس لئے کہ اس کے پاس دولت ہے اور ایک کامران و خوشگوار زندگی گزارنے کی ساری آسائشیں ــــ اور میں سماج کے بنائے ہوئے جھوٹے رسم و رواج کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہوں ــــ اس سے نکلنا ناممکن ہے ــــ مجھے معاف کر دو نوید ۔ ۔ ۔ ۔ ! اور مجھے بھول جاؤ ۔ اور تم بھی کسی سے شادی کر لو ۔ ۔ ۔ ۔ ! "

اور میں اس کے آگے ایک لفظ نہ سُن سکا ۔ انجم کی سسکیوں کی آواز میری سماعت میں زہر گھول رہی تھی ۔ ایک پل میں اُمیدوں کا حسین قلعہ مسمار ہو گیا تھا ۔ اور میں درد و غم کی بیکراں دولت لئے لوٹ آیا ۔

زندگی میں ویرانی بھر گئی تھی ــــ ہر شئے سے جی اُچاٹ ہو گیا تھا ــــ میری شفیق بھابی کی محبت و خلوص بھری باتیں ، اُن کی شفقت و اپنائیت بھی میرے دل میں خوشی کی جوت نہ جگا سکی ۔

کچھ دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ انجم کی نسبت شکیب سے طے ہو گئی ــــ میں تمام رات دُکھ کی صلیب پر لٹکا رہا ۔

زخم خوردہ زندگی کے سینے پر انجم نے اپنی بے اعتنائی کی مہر ثبت کر دی تو مجھے ہر شئے سے

نفرت ہونے لگی - چند جُملوں کی تحریر جس نے محبّت کا وہ نقش بھی کھرچ ڈالا جسے میں اپنی زندگی کی انمول شئے سمجھے ہوئے تھا - - -

میرے نوید — !

میری دی ہوئی کتابیں واپس کر دو - میں نہیں چاہتی کہ زمانے کی نظر اُن پر پڑے اور میری آئندہ زندگی اس سے اثر انداز ہو -

فقط انجُم

کتابیں تو میں نے واپس کر دیں لیکن انجُم کی بے اعتنائی کا زخم نہ بھر سکا اور میں اندر ہی اندر گھلتا رہا -

پھر ایک دن پتہ چلا کہ انجم کل پاکستان جا رہی ہے - اُس نے مجھ سے آخری بار ملنے کی خواہش ظاہر کی لیکن میں اُس سے نہ ملا - میں مزید اپنی محبّت کو فریب دینا نہ چاہتا تھا - اور یہ غم بھی جھیل گیا - پھر حیات میں ہمیشہ کے لئے اُداسی بھر گئی -

شام سویرے آتے رہے - دن روتے بسورتے گزرتے رہے اور پھر ایک دن میں بھی اس سرزمین سے پرواز کر گیا - کناڈا کے لئے — !

پانچ سال مُلازمت کے ساتھ تعلیم کے حصول میں یوں گزر گئے کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا - لیکن میری زندگی میں جو خلش رہ گئی تھی وہ کم نہ ہوئی - دولت میرے قدموں سے کھیل رہی تھی - زندگی کی تمام آسائشیں مہیا تھیں - لیکن دل کا سکون — ہونٹوں کی مُسکراہٹ رُوح کی مسرت — اور سکھ مجھ سے رُوٹھا ہوا تھا - میں کناڈا کے ماحول کی یکسانیت سے اُکتا گیا - بعد میں پاکستان چلا آیا - یہاں بھی عزّت و دولت میرے قدموں تلے ناچ رہی تھی — جس خوبصورت زندگی کا تصوّر انسان کرتا ہے — وہ مجھے میسّر تھی لیکن رُوح میں کسی کی یاد کا زخم اب بھی تازہ تھا اور میں تنہائی کا کرب لئے جی رہا تھا - شام کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو - میرے لئے ہمیشہ اُداس رہی ہے وہ ایک ایسی ہی خوبصورت لیکن اُداس شام تھی - میں اپنے دوست کی بہن کی شادی کی تقریب میں مدعو تھا - جب میں خوبصورت سجے ہوئے ہال میں پہنچا جو مہمانوں کے لئے آراستہ کیا گیا تھا تو میری نظریں اچانک انجم سے

ٹکرا گئیں۔

" نوید۔! تم یہاں کیسے۔؟ کب آئے۔؟"

میں چند لمحے اس کے چہرے کو تکتا رہا پھر بولا۔ "میں آج دو سال سے یہیں ہوں۔ پانچ سال کناڈا میں گزارے لیکن دل کی بے چینی وہاں بھی کم نہ ہوئی تو کراچی چلا آیا لیکن یہاں بھی میری ویرانیاں میرے ساتھ ہیں۔"

" نوید! کیا تم نے ابھی تک شادی نہیں کی۔؟" اس کی آنکھوں میں حیرانی اور آواز میں درد کی لرزش تھی۔

" نہیں انجم۔! میرے دل کے نہاں خانے میں جو تصویر ایک بار نقش ہو گئی ہے وہ نہیں مٹ سکتی۔ محبت کا وہ غیر فانی نقش جو کسی کی جدائی اور بے اعتنائی نے بخشا ہے اُسے کوئی نہیں بھر سکتا۔ انجم! قدرت کو یہی منظور تھا۔ تم تو خوش ہو نا؟" میری آواز میں بیکراں درد اور صدیوں کی اُداسی گھُلی ہوئی تھی۔

اُس کی خوبصورت آنکھیں بھیگ چلی تھیں اور چہرے پر اضمحلال کی زردی پھیل رہی تھی کہ ایک آواز میری سماعت کو زخمی کر گئی۔

" انجم۔!"

میں نے دیکھا شکیب آ رہا تھا۔

میں نے ایک نظر انجم کے بجھے بجھے چہرے پر ڈالی جو آنسوؤں سے نم ہو رہا تھا۔ اور میں تیزی سے ہال کے باہر نکل گیا۔

میری آنکھوں میں اُداس شام کا دھواں پھیل رہا تھا۔

منظومات

وحید متین

غزل

اہلِ دل خونِ وفا دیکھ چکے — اپنی قسمت کا لکھا دیکھ چکے
جس میں ارزاں ہوا انساں کا لہو — وہ بھی خوں بار فضا دیکھ چکے
دور اک ایسا بھی گذرا جس میں — خونِ ناحق کو روا دیکھ چکے
جو نہ دکھلائے خدا دشمن کو — وقت ایسا بھی بُرا دیکھ چکے

بارہا فصلِ بہاراں میں متینؔ!
جوشِ وحشت کو سوا دیکھ چکے

رئیس ناروی

غزل

ہوش اور خرد سے وہ یُوں بیگانہ لگے ہے
جس طرح کوئی عشق میں دیوانہ لگے ہے
کیونکر وہ سُنے حالِ پریشاں ترا اے دل
رُودادِ شبِ غم جسے افسانہ لگے ہے
پابندِ خرد ہو کے رہے دشتِ جنوں میں
دیوانہ تو ہر حال میں دیوانہ لگے ہے
مانا دلِ پُر شوق ہے ارمانوں سے آباد!
جب تم نہیں رہتے تو یہ ویرانہ لگے ہے
ہیں اہلِ سخن یُوں تو رئیسؔ اور بھی اچھے
لیکن ترا انداز جُداگانہ لگے ہے

غزل

حباب ہاشمی

سمجھ رہے تھے جو اک سازِ بے صدا مجھ کو
وہ سُن سکیں تو سُنیں آج برملا مجھ کو

مجھے وہ دیکھ کے منزل پہ آج حیراں ہے
سمجھ کے چھوڑ گیا تھا شکستہ پا مجھ کو

یہ اور بات کہ نظریں بچا گیا ہے وہ
گذر گیا ہے اِدھر سے وہ دیکھتا مجھ کو

میں اک ستون ہوں تہذیب اور ثقافت کا
میں گِر رہا ہوں ذرا بڑھ کے تھامنا مجھ کو

نہ رہروی کا سلیقہ نہ رہبری کا شعور
مگر یہ ضد ہے کہو اپنا رہنما مجھ کو

وہیں پہ منزلِ مقصود آ کے ٹھہری ہے
جہاں پہ چھوڑ گیا میرا قافلہ مجھ کو

حباب جس کو میں اپنا کبھی بنا نہ سکا
تمام عمر رہا اُس سے واسطہ مجھ کو

انتخاب سیّد

غزل

تُو مرے ساتھ نہ چل سوچ لے پچھتائے گا
راستہ بھُول گیا میں تو کہاں جائے گا

میرے اندر کا یہ انسان بڑا پیاسا ہے
قطرہ قطرہ مری آواز کا پی جائے گا

میں تو بس ڈُوبتے سُورج کی طرح زندہ ہوں
سچ تو یہ ہے کہ زمانہ ترے کام آئے گا

کتنے بے نام عقیدوں کو لئے پھرتا ہوں
لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص سزا پائے گا

دیکھتے دیکھتے ہر چیز بدل جائے گی
دیکھتے دیکھتے چیزوں پہ زوال آئے گا

قمر صدیقی

غزل

جہاں پہ تم کو اندھیرا دکھائی دیتا ہے
مجھے وہاں بھی اُجالا دکھائی دیتا ہے

وہ زندگی کا سہارا وہ گلشنِ اُمید
غموں کی دُھوپ میں جلتا دکھائی دیتا ہے

یہ انقلابِ زمانہ ہے یا فریبِ نظر
ہر ایک گھر مجھے صحرا دکھائی دیتا ہے

کوئی تو بات ہوئی ہے ضرور ہم نفسو
کہ ذرّہ ذرّہ تڑپتا دکھائی دیتا ہے

جدھر بھی دیکھئے میلا لگا ہوا ہے مگر
جسے بھی دیکھئے تنہا دکھائی دیتا ہے

قمرؔ جنوں کی ہے اب وسعتِ نظر کا یہ حال
کہ ذرّے ذرّے میں صحرا دکھائی دیتا ہے

فضل اللہ خاں فضل کوٹی

غزل

ضبطِ فغاں نہیں دلِ ناشاد ماں نہیں
شائستۂ مذاقِ محبّت فغاں نہیں

گلچیں نہیں ہے' برق نہیں' باغباں نہیں
یہ تو کوئی قفس ہے' مرا آشیاں نہیں

تُو مجھ سے پُوچھتا ہے پپیہے کی پی کہاں؟
اے بے خبر مجھے یہ پتا پی کہاں نہیں

دِل کو تو چین آئے' یہ دردِ جگر تو جائے
سَر دے کے ہو وصال تو سجدہ گراں نہیں

اے فضل ایک اُن کے نہ ہونے کا یہ اثر
سب کچھ ہے گلستاں میں مگر وہ سماں نہیں

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

مطبوعاتِ موصولہ

زخمِ ہنر | شاعر لکھنوی کا پہلا مجموعۂ کلام ہے اور صرف اُن کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ شاعر لکھنوی تعارف کے محتاج نہیں، اُن کی غزل گوئی کی لطیف و معنی خیز نہج نے اپنی انفرادیت و اہمیت، کو اشاعتِ کلام سے پہلے ہی منوا لیا تھا، پچھلے تیس بتیس سال میں، اُردو کے جو غزل گو شعرا سامنے آئے، خصوصاً جو نام لکھنؤ کے گرد و نواح سے تازہ فکر و اُسلوب کے ساتھ اُبھرے اُن میں شاعر لکھنوی بھی شامل ہیں، آنند نرائن ملّا، اسرار الحق مجاز، مجروح سلطان پوری، اور شاعر لکھنوی، اودھ کے اُن غزل گو شعرا میں سے ہیں، جو مولانا حسرت موہانی، فراق، یگانہ اور اصغر گونڈوی کی جمیل و جلیل اندازِ غزل گوئی سے متاثر بھی رہے اور جنہوں نے، اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق، غزل کے پیکر میں جمال و جلال کے نئے آثار بھی پیدا کئے۔

شاعر لکھنوی کے غزل کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ کلاسیکی غزل کی رمزیت اور جدید غزل کی علامت پسندی، دونوں سے ہم آہنگ ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک طرف وہ غزل کی ثقہ روایات کے محافظ ہیں دوسری طرف اُن میں اُن روایات کو زندہ رکھنے کے لئے، اُن میں فکر و احساس کی نئی لہر دوڑانے کا بھی پورا سلیقہ ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنی شاعری میں جہاں، بہت پُرانی علامتوں کو نئی معنویت دی ہے وہاں، اپنے دور کی معنویت کے لئے بالکل نئی علامتیں بھی وضع کی ہیں۔

"زخمِ ہنر" عمدہ کاغذ پر، نفیس کتابت و طباعت کے ساتھ مجلّد ہو کر منظرِ عام پر آیا ہے۔ اور پچیس روپے میں، ہر بک اسٹال سے مل سکتا ہے۔

SELECTED POEMS | ڈاکٹر وزیر آغا کی اُردو نظموں کے انگریزی تراجم کا مجموعہ

...گیا ہے۔

...میں اُن کی دین،

...جدید غزل اور جدید نظم

...اور استعاراتی نظموں کو اُردو

...ہے۔

...مترجمین

...سجاد شیخ، ایس۔ اے قدوائی، ...

...اکرام علیم، محمد افضل ملک، ایم آئی بھٹی، رانا نقی،
منور گل، فاطمہ اطہر، سلیم آغا قزلباش، جمیل آذر، اور مشتاق قمر کے نام شامل ہیں۔
نظموں کا انتخاب و تعارف، جمیل آذر اور مشتاق قمر کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ ہر چند کہ تراجم کا یہ مجموعہ بہت مختصر اور صرف نوّے صفحات پر مشتمل ہیں، لیکن چونکہ مترجمین میں معتبر اہلِ قلم شامل ہیں، ایسے اہلِ قلم، جو تخلیق کی کربناک اور نشاط انگیز، منزلوں کا بھی تجربہ رکھتے ہیں۔ اس لئے اس میں ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری کا سارا عطر تقریباً کھنچ آیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آغا صاحب کی شاعری کی خوشبو، ان ترجموں کے ذریعے اُردو خواں طبقے کی حدود سے آگے بڑھ کر انگریزی ادب کے قارئین تک پہنچے گی اور آغا صاحب کی نظموں کی معرفت، اُردو زبان و ادب کے شائقین کا ایک نیا حلقہ بنے گا۔

شاگردانِ انیس

ڈاکٹر قمقام حسین جعفری پچھلے کئی برسوں سے، اُردو مرثیہ اور میر انیس سے متعلق موضوعات پر مسلسل لکھ رہے ہیں، چونکہ انہوں نے اپنے مطالعے کو خاص شعبے پر مرکوز کر دیا ہے اس لئے اُن کے قلم نے، اس سلسلے میں اختصاص کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اُن کی مطبوعہ تصنیفات میں، آثارِ انیس، تحقیقی نوادر اور گلزارِ تخمیس وغیرہ، اُن کے اختصاص کی مثالیں ہیں، ان مثالوں میں زیرِ نظر، تصنیف "شاگردانِ انیس" ایک اور قابلِ قدر اضافہ ہے۔

ہر چند کہ کتاب کا اصل موضوع، میر انیس کے شاگردوں کی نشان دہی اُن کی زندگی

... لیکن ...

کی خدمات و کمالات کا اعتراف و تعین ...

باشعور ادیب کی حیثیت سے، مرثیہ اور انیس سے متعلق ...

رکھتی ہے اور اُن کی روشنی میں انیس کے شاگردوں ... یہ کتاب

پہلے اس موضوع پر مواد، نہ ہونے کے برابر تھا اور ہماری معلومات بہت محدود تھیں۔

... حسین صاحب کی معرفت بہت سے نئے نام، ضروری لوازم و تفصیلات کے ساتھ سامنے

آئے اور مرثیہ کے نئے مطالعے کے لئے تازہ راہیں کھل گئیں۔

ناسخ، حیات و تصانیف | ڈاکٹر صدرالحق ...

... پریس ... سے ... ۔

عبدالغفور ناسخ کی ہمارے ادب میں کئی حیثیتیں ہیں، شاعر، تذکرہ نگار، نقاد ... ان سب کا اطلاق، اُن کی عالمانہ شخصیت پر ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اُن کے ... اور ... توجہ، مواد، ہمارے سامنے نہ تھا۔ ڈاکٹر صدرالحق شکریے کے ... ہیں ... اس موضوع کو ... ناسخ کو منظر عام پر لے آئے۔

ڈاکٹر صاحب نے ناسخ کی ... تصنیف ... چشمک، تذکرہ، اور فکر و فن، سب پر ... ہے ... تنقیدی شعور کا ثبوت دیا ہے۔ ناسخ کی وفات کو خاصا وقت گزر گیا ہے ... کے سبب اُن کی زندگی اور شخصیت کے منتشر اجزاء کو صحت و سند کے ساتھ یکجا کرنا اور مختلف مبصرین و ناقدین کے بیانات پر جرح و بحث کر کے اُن سے نتائج اخذ کرنا، آسان کام نہ تھا۔ لیکن ڈاکٹر صدرالحق نے اس کام کو کمالِ ذمہ داری کے ساتھ پورا کیا ہے۔ اور ناسخ کو ادب کی تاریخ میں ایک نئی زندگی بخش دی ہے۔

کتاب، انجمن ترقی اردو پاکستان کی طرف سے، سلیقے سے شائع ہوئی ہے اور تیس روپے

ہے اور خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ مکتبۂ اُردو زبان سرگودھا نے شائع کیا ہے ۔

ڈاکٹر وزیر آغا، شاعر ہیں، نقاد ہیں، انشائیہ نگار ہیں اور ہر شعبے میں اُن کی دین قابلِ توجہ اور ناقابلِ فراموش ہے، جدید تنقید کے ساتھ ساتھ، جدید غزل اور جدید نظم کی ترویج و توثیق میں بھی اُن کا نمایاں حصّہ ہے ۔ علامتی اور استعاراتی نظموں کو اُردو میں مانوس و مقبول بنانے میں بھی اُن کی شاعری نے خاص کردار ادا کیا ہے ۔

منتخب نظموں کے یہ تراجم، کسی ایک فرد کی کاوش کا نتیجہ نہیں ۔ اِن کے مترجمین میں آر۔ اے خان، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، بلراج کومل، ایس۔ اے درّانی، سجّاد شیخ، رانا تقی، ایم آئی بھٹی، محمد افضل ملک، اکرام علیم، آزاد گلاوٹی، راجندر سنگھ ورما، متوّر گل، فاطمہ اطہر، سلیم آغا قزلباش، جمیل آذر، اور مشتاق قمر کے نام شامل ہیں ۔ نظموں کا انتخاب و تعارف، جمیل آذر اور مشتاق قمر کی توجہ کا نتیجہ ہے ۔ ہر چند کہ تراجم کا یہ مجموعہ بہت مختصر اور صرف نوّے صفحات پر مشتمل ہیں، لیکن چونکہ مترجمین میں معتبر اہلِ قلم شامل ہیں، ایسے اہلِ قلم، جو تخلیق کی کربناک اور نشاط انگیز، منزلوں کا بھی تجربہ رکھتے ہیں۔ اس لئے اس میں ڈاکٹر وزیر آغا کی شاعری کا سارا عطر تقریباً کھنچ آیا ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ آغا صاحب کی شاعری کی خوشبو، ان ترجموں کے ذریعے اُردو خواں طبقے کی حدُود سے آگے بڑھ کر انگریزی ادب کے قارئین تک پہنچے گی اور آغا صاحب کی نظموں کی معرفت، اُردو زبان و ادب کے شائقین کا ایک نیا حلقہ بنے گا ۔

شاگردانِ انیس

ڈاکٹر قمقام حسین جعفری پچھلے کئی برسوں سے، اُردو مرثیہ، اور میر انیس سے متعلق موضوعات پر مسلسل لکھ رہے ہیں، چونکہ اُنہوں نے اپنے مطالعے کو خاص شعبے پر مرکوز کر دیا ہے اس لئے اُن کے قلم نے، اس سلسلے میں اختصاص کی صورت اختیار کر لی ہے ۔ اُن کی مطبوعہ تصنیفات میں، آثارِ انیس، تحقیقی نوادر اور گلزارِ نفیس وغیرہ، اُن کے اختصاص کی مثالیں ہیں، ان مثالوں میں زیرِ نظر، تصنیف "شاگردانِ انیس" ایک اور قابلِ قدر اضافہ ہے ۔

ہر چند کہ کتاب کا اصل موضوع، میر انیس کے شاگردوں کی نشان دہی اُن کی زندگی

شاعری پر تبصرہ ہے۔ لیکن اس میں مرثیہ نگاری کے آغاز و ارتقا کی ساری تاریخ اور پس منظر کو اختصار کے ساتھ سمیٹ لیا گیا ہے۔ ایسا کرنا یُوں ضروری تھا کہ اس کے بغیر، شاگردانِ انیس کی خدمات و کمالات کا اعتراف و تعیّن مشکل تھا۔ قمقام حسین صاحب نے ایک با مطالعہ اور باشعور ادیب کی حیثیت سے، مرثیہ اور میر انیس سے متعلق، جملہ مباحث و موضوعات پر نظر رکھی ہے اور اُن کی روشنی میں انیس کے شاگردوں سے ہمیں متعارف کرایا ہے۔ اس کتاب سے پہلے، اس موضوع پر مواد، نہ ہونے کے برابر تھا اور ہماری معلومات بہت محدود تھیں۔ قمقام حسین صاحب کی معرفت بہت سے نئے نام، ضروری لوازم و تفصیلات کے ساتھ، سامنے آئے اور مرثیہ کے لئے مطالعے کے لئے تازہ راہیں کھل گئیں۔

ناسخ، حیات و تصانیف

ڈاکٹر صدر الحق کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر ڈھاکہ یونیورسٹی نے، اُنھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی ہے۔

عبدالغفور ناسخ کی ہمارے ادب میں کئی حیثیتیں ہیں، شاعر، تذکرہ نگار، ناقد، نثار اور اُستادِ زبان و فن، سبھی کا اطلاق، اُن کی عالمانہ شخصیت پر ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اُن کے بارے میں، کوئی مستند اور قابلِ توجہ، مواد، ہمارے سامنے نہ تھا۔ ڈاکٹر صدر الحق شکریے کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے اس اہم موضوع کی طرف رجوع کیا اور تحقیق و تنقید کے ذریعے، کمالاتِ ناسخ کو منظرِ عام پر لے آئے۔

ڈاکٹر صاحب نے ناسخ کی زندگی، شخصیت، شاعری، تذکرہ نگاری، اُستادی، معاصرانہ چشمک، تلامذہ، اور فکر و فن، سب پر الگ الگ باب قائم کئے ہیں۔ اور ہر باب میں تحقیقی و تنقیدی شعور کا ثبوت دیا ہے۔ ناسخ کی وفات کو خاصا وقت گزر گیا ہے اور اس بُعدِ زمانی کے سبب اُن کی زندگی اور شخصیت کے منتشر اجزاء کو صحت و سند کے ساتھ یکجا کرنا اور مختلف مبصرین و ناقدین کے بیانات پر جرح و بحث کرکے اُن سے نتائج اخذ کرنا، آسان کام نہ تھا۔ لیکن ڈاکٹر صدر الحق نے اس کام کو کمالِ ذمہ داری کے ساتھ پُورا کیا ہے۔ اور ناسخ کو اردو ادب کی تاریخ میں ایک نئی زندگی بخش دی ہے۔

کتاب، انجمن ترقی اُردو پاکستان کی طرف سے، سلیقے سے شائع ہوئی ہے اور تیس روپے

میں مل سکتی ہے۔

شام کا پہلا تارا | عہدِ حاضر کی ممتاز شاعرہ، زہرا نگاہ کا مجموعۂ کلام ہے، دیدہ زیب طباعت و کتابت نفیس، جلد اور خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ

چھپا ہے، قیمت پچیس ۲۵ روپے ہے۔

پچھلی چار پانچ دہائیوں میں، اردو کی شعری تاریخ میں، بہت سی باتیں قابلِ ذکر ہونگی لیکن میرے زاویۂ نظر سے سب سے نمایاں بات یہ ہوئی ہے کہ پہلی بار، چند معتبر شاعرات کے نام ہمارے سامنے آئے ہیں، میری مراد، ادا جعفری، صفیہ شمیم اور زہرا نگاہ سے ہے، ان کی تخلیقات سے صرف یہی نہیں کہ اردو شاعری، جذبے اور احساس کی سطح پر صنفِ نازک کے بعض ایسے تجربات سے آشنا ہوئی، جس سے وہ اِس سے پہلے نابلد تھی بلکہ یہ بھی ہوا کہ خواتین کی تخلیقی صلاحیتوں کو رتبۂ اعتبار میسر آیا، ورنہ اِن سے پہلے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شعر و سخن کے باب میں، خواتین کے جو نام، معروف ہیں، وہ درپردہ کسی صنفِ قوی کے رہینِ منّت ہیں۔ زہرا نگاہ کی شاعری نے مشاعرے کی فضا سے لے کر مطالعے کے میدان تک اس تہمت کا پردہ چاک کیا اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اپنے پرائے سب سے لوہا منوالیا۔

زہرا نگاہ کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف وہ عورت کے جذبات کی ترجمان ہونے کے ناطے سے، اردو شاعری کو آدھے آدمی کی نہیں پورے آدمی کی شاعری بناتی ہے۔ دوسری طرف ایک عام ذمّہ دار شہری کی حیثیت سے اپنے گرد و پیش اور اپنے عہد کی زندگی کے مسائل سے دست و گریباں بھی نظر آتی ہے۔ چنانچہ اُن کی شاعری میں جہاں ایک ماں، بہن، سہیلی، بیٹی، بیوی اور عورت کا دل دھڑکتا نظر آتا ہے وہاں سامنے کی جدید دنیا کے ایک حسّاس اور ذمّہ دار فرد کے شعور کا ارتعاش بھی جھلک رہا ہے، جذبے اور شعور کے اس امتزاج نے زہرہ نگاہ کی شاعری کو ہلکی پھلکی رومانی شاعری کے مرتبے سے بہت بلند کر کے سنجیدہ مطالعے کی چیز بنا دیا ہے، صرف چند شعر دیکھیے:

جس سے کچھ نہ کہہ پائیں جانِ گفتگو ٹھہرے
جس سے کم ملیں اُس کو سب سے بیشتر جانیں

اپنا عکس بھی اکثر ساتھ چھوڑ جاتا ہے
یہ مآلِ خودبینی کاش شیشہ گر جانیں

ہم سے بڑھی مسافتِ دشتِ وفا کہ ہم ——— خود ہی بھٹک گئے جو کبھی راستہ چلا

کیوں گھر کے اب آئے ہیں یہ بادل یہ گھٹائیں ——— ہم نے تو تجھے دیر ہوئی یاد کیا تھا

ہم خاک تھے پر جب اُسے دیکھا تو بہت روئے ——— سُنتے تھے کہ صحراؤں میں دریا نہیں ہوتے

وحشت میں بھی منت کشِ صحرا نہیں ہوتے ——— کچھ سنگ بکھر کر بھی پریشاں نہیں ہوتے

ملگجے کپڑوں میں اُس دن کس غضب کی آب تھی ——— سارے دن کا کام اُس دن کس قدر ہلکا ہوا

جو لوگ، غزل کے اِن لطیف و سُبک اشعار کا رُوح کی گہرائیوں کے ساتھ ادراک نہ
سکیں، اُنھیں، زہرا نگاہ کی بعض نظموں مثلاً شام کا پہلا تارا، جرم وعدہ، آنگن، گُل چاندنی، عیدِ بہار، اگر تم ہو تو، دلالہ، مری سہیلی، ایک لڑکی، اپنے بیٹے کے نام، ویت نام، جنوبی افریقہ، احتساب، وغیرہ کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ اِن میں زہرا نگاہ کے احساس و شعور کی دُنیا، قدرے وضاحت جمال و جلال کے ساتھ سامنے آئی ہے اور آسانی سے دل و
ہ میں اُترتی چلی جاتی ہے۔

ستم مجموعہ ہے، قدرے گمنام لیکن ہر طرح قابلِ توجہ ادیب کے مضامین کا، میری مُراد رام لعل نابھوی سے ہے، جن کا نام ممکن ہے کہ عام قارئین کے ذہن میں نہ ہو اس لئے کہ وہ لکھتے بھی کم ہیں اور اپنے مضامین شائع بھی بہت کم کرتے ہیں، پھر بھی وہ غیر معروف نہیں، اُن کی ایک آدھ چیز بھی، جن کی نظر سے گزری ہے وہ اس بات کی شہادت
ر اُن کی شگفتہ نگاری ایک خاص معیار اور وقار رکھتی ہے۔

رام لعل نابھوی، سے میری ملاقات، ایک ہی دفعہ دہلی میں ہوئی لیکن اُن کی باتوں سے ندازہ ہو گیا کہ اُن کی شخصیت پر تکلف و تصنع کا غازہ نہیں ہے، وہ کھرے اور سچے
ی اور جو کچھ دل میں رکھتے ہیں برملا ظاہر کر دیتے ہیں، اُن کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ!

وہ جو کچھ اور جیسے ہیں، ہر جگہ اور ہر محفل میں ویسے ہی نظر آتے ہیں، اُن کی طبیعت
، جو شگفتگی و بذلہ سنجی ہے، وہ اُن کی تقریر و تحریر، دونوں میں نمایاں رہتی ہے، اس
مزاج اور اس سرشت کے ادیب کے یہاں اگر زندگی کی سچی، کھری، دلآویز اور حیات افروز

پھلجھڑیاں نظر آئیں تو چنداں تعجب کی بات نہیں۔ اُن کے مضامین جنھیں
انشائیہ کہنا چاہیئے، مشینی زندگی اور صنعتی تہذیب کے سارے عذاب
کی ساری جبریت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں لیکن رام لعل نابھوی کے
کہئے کہ وہ اپنی تحریروں میں کہیں بھی آزردہ و دل شکستہ نظر نہیں آتے ہیں، اُ
کام لینے کا عجب سلیقہ ہے، کوئی عالم ہو اُن کے چہرے کی مُسکراہٹ
بشاشت نہیں جاتی، اُن کا اپنا دُکھ، کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو وہ اس
قاری پر مسلط نہیں کرتے بلکہ زندگی سے نبرد آزما رہنے، اس کی جبریت
غم کو خوشی میں، تیرگی کو روشنی میں، کہولت کو توانائی میں، اور آنسوؤں
بدل دینے پر آمادہ رکھتے ہیں۔

افسوس کہ تبسم، پر اس جگہ تفصیل سے لکھنے کی گنجائش نہیں
کہ جنہیں سچے اور شگفتہ انشائیوں کی نایابی کا شکوہ ہے، اُنھیں، را
مضامین کو ضرور دیکھنا چاہیئے۔ پُوری کتاب دیکھنے کا موقع نہ ہو
ہی دیکھ لیں، جو رام لعل نابھوی نے کتاب پر لکھا ہے کہ یہ دیباچہ بذا
انشائیہ ہے۔

نگار پاکستان

جاری شدہ ۱۹۲۲ء

بانی علامہ نیاز فتحپوری

مدیر

فرمان فتحپوری

رجسٹرڈ ایل نمبر ۲۴۷۲ — جاری شدہ سنہ ۱۹۲۲ء

تعلیمی اداروں کیلئے محکمہ تعلیم کراچی سے منظور شدہ سرکلر نمبر ڈی ۵/الف یو بی ۳۳۹

بانی
علامہ نیاز فتح پوری

نگار پاکستان

مدیر
ڈاکٹر فرمان فتح پوری

معاونین

کامل القادری —— ریاض صدیقی
امراؤ طارق —— فردوس حیدر

دفتر

۶۰ - درلی روڈ - گارڈن ایسٹ - کراچی ۳

ملسلت - سی - ۲۸ - بلاک ۱۳ - ڈی گلشن اقبال کراچی

فون: ۴۱۹۹۶۸

زیر نظر شمارہ شعبان ابن عربی اردو مجلہ —— ۵ روپیہ 7.50

سید اختر حسین نے ایجوکیشنل پریس سے چھپوا کر ۱۵۹ - اے قمر کتاب گھر اردو بازار سے شائع کیا

فہرست

۵۹ واں سال	مئی جون سنہ ۱۹۸۰ء	شمارہ ۵-۶

ملاحظات

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

ملاحظات

بھارت میں ایک مہینے تین دن
(۳)

مجلسِ مذاکرۂ علمیہ اسے حُسنِ اتفاق کہیے یا حُسنِ توارد کہ ۱۱ نومبر ۸۶ کو خواجہ حسن نظامی کے پچیسویں سالانہ عُرس کے سلسلے میں، پاک و ہند مجلسِ مذاکرۂ علمیہ کا انعقاد بھی ہونا تھا۔ اس لئے غالب سیمنار کی نشستوں کو مختصر کرکے ڈیڑھ دن میں سمیٹ لیا گیا اور ۱۱ نومبر کا نصف دن اور تقریباً پوری رات، خواجہ حسن نظامی کے لئے وقف کر دی گئی۔ چنانچہ لنچ کے بعد، غالب سیمنار کے شرکا نے، حسن نظامی میموریل ہال کا رُخ کیا۔

خواجہ حسن نظامی صاحب کے لائق فرزند خواجہ حسن نظامی ثانی، کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، پاکستان میں بھی لوگ، اُن کے نام سے ناواقف نہیں۔ دلّی میں تو میں نے یہ دیکھا کہ سارا شہر اُن کا گرویدہ ہے۔ اللہ نے انھیں، بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے۔ اُن کے قلم، اُن کے خیالات، ان کی شخصیت، اور اُن کے اخلاق، سب میں ایک کشش ہے، وہ ایک مدیر، ایک ادیب، خواجہ حسن نظامی کے جانشین، مسلکِ تصوف کے سفیر اور منتظم، ہر حیثیت میں کامیاب نظر آئے۔ شیخ سعدی نے ایسوں ہی کے بارے میں کہا ہے کہ: "آنچہ پدر نہ تواند پسر تمام کند"، اُنھوں نے اس علمی مذاکرے کا جس بڑے پیمانے پر اہتمام کیا تھا، وہ عُرس کی محفلوں میں بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اس اہتمام میں، اُردو کے ادیبِ شہیر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی مساعیٔ جمیلہ کو بھی خاصا دخل تھا۔ وسیع و عریض نظامی ہال بجلی کے قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ دہلی کے اہلِ دل اور اہلِ علم سبھی جمع تھے۔ ملک کے دوسرے صوبوں سے آنے والوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔

اس علمی مذاکرے کیلئے دو خاص موضوعات تھے، ایک کا عنوان تھا "اسلامی فکر کے چودہ سو سال" اور دوسرے کا "خواجہ حسن نظامی حیات و خدمات" افتتاحی اجلاس کی صدارت دارالعلوم دیوبند کے سربراہ، مولانا قاری محمد طیب صاحب نے فرمائی۔ اُن کا بصیرت افروز خطبہ سامعین کے قلب و ذہن، دونوں کو روشن کر گیا۔ علم و فکر پر دسترس اور اظہار خیال پر قدرت کسے کہتے ہیں۔ یہ مولانا کی تقریر سُننے کے بعد سمجھ میں آیا۔ پچھلے چودہ سو سال میں انسان کی تہذیبی زندگی، سیاست و قیادت، علم و حکمت اور صنعت و سائنس کی سطح پر کن کن مرحلوں سے گذری ہے۔ اور مختلف اقوام و ملل نے، ان مرحلوں میں کس نوع کا کردار کیا ہے، مولانا نے اس سب کے عالمانہ تجزیہ کے ساتھ ملّتِ اسلامیہ کے کردار کا جائزہ لیا اور مستقبل میں اُس کے روشن امکانات کی نشاندہی فرمائی۔

خواجہ حسن نظامی کی ادبی خدمات دوسرے اجلاس، کے مقالات، حضرت خواجہ حسن نظامی کی زندگی اور خدمات کے لئے مخصوص تھے۔ بہت سے مقامی و غیر مقامی عالموں اور دانشوروں نے اس میں شرکت کی۔ پاکستانی ادیبوں میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اور شان الحق حقی صاحب نے مضامین پڑھے۔ میں نے زبانی اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔

"خواجہ حسن نظامی صاحب کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا اور کہا جا سکتا ہے، لیکن وقت کی تنگی کے سبب، میں چند لفظوں میں صرف اس قدر عرض کروں گا کہ اُردو زبان و ادب کے حوالے سے خواجہ صاحب کی دو خوبیاں بہت نمایاں ہیں، اتنی نمایاں کہ اُردو نثر کا کٹر سے کٹر ناقد اور مؤرخ بھی اُنھیں کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا؛ ایک تو یہ کہ انشاپردازی کا جو سلیقہ اُن میں تھا وہ میرامّن سے لے کر، مولوی عبدالحق تک، چند ادیبوں کے سوا، کسی اور کے یہاں نظر نہیں آیا۔ وہ اُردو کے صاحبِ طرز نثر نگار ہی نہیں بے مثال نثر نگار ہیں، خاص کمال یہ ہے کہ اُن کی نثر ہر قسم کی صنّاعی، ہُنرمندی، کاریگری، یا خاص قسم کا اُسلوب تخلیق کرنے کی شعوری کوشش سے یکسر پاک ہے، حُسنِ ذات اور حُسنِ فطرت کی طرح اُن کی نثر کا حُسن بھی سادہ و معصوم اور خارجی آرائش سے بے نیاز ہے۔ ذوق نے کہا تھا:

تکلف سے بری ہے حُسنِ ذاتی قبائے گُل میں گُل بوٹا کہاں ہے!

خواجہ حسن نظامی کی نثر پر اس کا پُورا پُورا اطلاق ہوتا ہے، جس طرح گلاب، اپنی سادہ و یک رنگ قبا کے باوصف، سارے پھولوں کا سرتاج ہے، اُسی طرح اُن کی نثر حد درجہ سادگی کے باوجود بڑی پُرکار ہے۔ بظاہر یُوں لگتا ہے جیسے، اس میں قاری کے لئے کشش کا کوئی سامان نہیں ہے، لیکن جیسے جیسے پڑھتے جائیے اُس کی مقناطیسیت بڑھتی جاتی ہے اور دل و دماغ دونوں کو مسحور کرلیتی ہے۔ غالب نے شاید اسی قسم کی سادگی و پُرکاری کے بارے میں کہا تھا کہ :-

سادگی و پُرکاری، بے خودی و ہشیاری

حُسن کو تغافل میں جُرأت آزما پایا !

" خواجہ صاحب کی نثر کا دوسرا وصف یہ ہے کہ موضوع و مواد کی جیسی رنگارنگی، اُس میں ہے اُن کے ہم عصر نثر نگاروں میں نیاز فتحپوری کے سوا کم نظر آتی ہے۔ اُنہوں نے، مذہب، تصوف، معقولات، تاریخ، فلسفہ اور ادبیات کے دقیق سے دقیق موضوعات پر قلم اُٹھایا، اور انشائیہ کے انداز میں دیاسلائی اور جھینگر جیسے بے جان و کم سواد چیزوں پر بھی بہت کچھ لکھا اور حیرت انگیز حد تک ہر جگہ اُن کے قلم کی بوقلمونی اور جادو نگاری یکساں برقرار رہی اور ایسی بلند سطح کے ساتھ کہ دوست دُشمن سبھی نے اُنھیں، ایک صاحبِ طرز نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کا نباض اور اُس کے مرض کا مسیحا تسلیم کیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی صفات کی بنا پر اُردو زبان و اَدب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔"

<u>یادگار قہوہ خانہ</u> علمی مذاکرے کے سلسلے کا یہ شاندار اجتماع، رات کو ۹ ½ بجے اختتام کو پہنچا اور لنگر کا اعلان ہوا۔ لیکن لنگر کیا تھا، پُرتکلف کھانوں کا غیر معمولی دسترخوان تھا، کئی سَو مہمان، لذتِ کام و دہن سے سیراب ہوئے۔

گھنٹوں کے بعد، ۱۱ بجے رات کے قریب، اس اجتماع سے باہر نکلے تو کسی گوشے میں سمٹ جانے کو جی چاہا۔ نظامی ہال سے تھوڑی دُور پر، مرزا غالب کے مزار سے قریب، چھوٹا سا چائے خانہ تھا۔ لکڑی کی معمولی بنچیں ایک درخت کے سائے میں پڑی تھیں۔ اُسی کو غنیمت سمجھا گیا کہ ۱۲ بجے رات کو بھی کُھلا ہوا تھا۔ رشید حسن خاں، نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر خلیق انجم، شفاء الحق حقی اور بعض دوسرے احباب جم کر بیٹھ گئے۔ سبھی کا موڈ یہ تھا کہ صبح سے شام تک، ذہن کو جس غیر معمولی سنجیدگی

سے واسطہ رہا ہے، اُس سے ذرا دیر کے لئے نجات حاصل کی جائے، چنانچہ جائے کے ساتھ ساتھ، لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، نکتہ بندی، قافیہ پیمائی، حکایت سازی، اور ہزل گوئی کا دور چلا۔ جعفر زٹلی سے لے کر رفیع احمد خاں تک، مختلف ہزل نگاروں کے ایسے ایسے اشعار، کبھی دبی زبان سے، کبھی بالاعلان، کبھی بعض الفاظ کو محذوف کر کے اور کبھی اضافہ اور ترمیم کے ساتھ، سُنے سُنائے گئے اور اتنی کثرت سے کہ واقعی انشراحِ قلب ہو گیا۔ جب ہنسنے ہنسانے کی تاب بھی باقی نہ رہی تو چار و ناچار گھر یاد آیا، گھر پہنچ کر بقول سعدی :-

"نخستین دشمن کہ بر سرِ ما تاخت آوردہ خواب بود" ۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ ۸ کی شام کو دہلی پہنچا تھا، رات ہی کو، مالک رام صاحب؟ اپنے سفیر عبدالستار صاحب اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب سے فون پہ بات ہو گئی، اور ملاقات کا وقت طے پا گیا۔ خواجہ احمد فاروقی صاحب نے اصرار کیا کہ کل شام کھانا میرے ساتھ کھائیں۔ میں نے کہا اتنی جلدی کیا ہے؟ لیکن نہ مانے، چنانچہ ۸ بجے کے قریب خلیق انجم صاحب کے ساتھ دہلی یونیورسٹی کیمپس میں خواجہ صاحب کے گھر پہنچا۔ والہانہ انداز سے بڑی محبت سے ملے۔

خواجہ صاحب کو تیس بتیس سال پہلے حلیم مسلم کالج کانپور میں دیکھا تھا۔ اُن کی تحریر میں جو ادبیت و شگفتگی ہے وہی اُن کی تقریر میں تھی۔ بعد کو اُن کی تصانیف و تالیف سے برابر استفادہ کیا۔ میر تقی میر حیات اور شاعری، کلاسیکی ادب، مرزا شوقی لکھنوی، تذکرہ سرور، دیوانِ بقا، اور دیوانِ سوز، سبھی مطالعے میں آئیں اور خواجہ صاحب کے نقش کو ذہن میں روشن کر گئیں۔

خواجہ صاحب کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع تھا "مکتوباتِ اُردو کا ادبی و تاریخی جائزہ" یہ مقالہ جانے کیوں مطبوعہ شکل میں نہ آیا، طبع ہوتا تو کام کی چیز ہوتا۔ بہر حال اس غیر مطبوعہ مقالہ کا ایک جزو، جس کا تعلق نیاز فتح پوری کے مکتوبات سے تھا میں نے نگار کے نیاز نمبر بابت مارچ اپریل ۱۹۶۳ء میں اُن کی اجازت کے بغیر لیکن اُن کے ایک معتمد کے اشارے پر شائع کر دیا تھا۔ خواجہ صاحب سے کوئی تین گھنٹے کی ملاقات رہی، نیاز فتح پوری اور مولوی عبدالحق کا ذکر دیر تک رہا۔ خواجہ صاحب اُن سے اپنی نیاز مندی اور تعلقِ خاطر کی داستان سُناتے رہے۔ پاکستانی جامعات کے علمی و ادبی مشاغل، اور تدریسی و تعلیمی معیار کی کیفیت کا حال مجھ سے پوچھتے رہے

یہیں علی گڑھ یونیورسٹی گیا کے پروفیسر ڈاکٹر سیّد محمد حسنین صاحب سے ملاقات ہوتی اور مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال ہوا۔ خواجہ احمد فاروقی کا دسترخوان بھی اُن کی شخصیت کی طرح پُرکشش، متنوع وجامع تھا، رُخصت ہوتے وقت اپنی کتاب، "ذوق وجستجو" کا ایک نسخہ بھی اُنہوں نے از راہِ محبت عنایت فرمایا۔ گویا جسم وجان دونوں کی سیرابی کا سامان فراہم کردیا۔

مالک رام | ۱۲ر نومبر کا پورا دن، اُن کے حکم کی تعمیل میں، مالک رام صاحب کے ساتھ گزارنا تھا، چنانچہ ۱۰ بجے، صبح پہنچ گیا۔ غالب سیمنار اور خواجہ حسن نظامی کے عُرس میں، حسرت آمیز اور تشنگی انگیز، سرسری سی ملاقات ہوچکی تھی۔ ملاقات کیا تھی ایک بجلی سی کوندگئی تھی اور غالب کا یہ شعر بار بار ذہن میں آرہا تھا :ـ

بجلی اک کوندگئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

آج اس تشنگی کو بجھانے اور اپنے عہد کے ایک قدآور ادیب ومحقق کو جی بھر کر دیکھنے کا موقع میسّر آیا تھا۔ مالک رام صاحب سے ملاقات تو اس سے پہلے نہ ہوئی تھی۔ تاہم ربط ذہنی اور تعلق قلبی، ایک مدّت سے قائم تھا۔ دوچار خطوط بھی آئے گئے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں میری پہلی تحقیقی کتاب "اُردو رُباعی کا فنّی وتاریخی ارتقا" بہت خراب طباعت وکتابت کے ساتھ چھپی تھی۔ اُس وقت مالک رام صاحب ہندوستانی سفارت خانے کے ایک رُکن کی حیثیت سے بلجیم میں تھے۔ کتاب نظر سے گذری تو حد درجہ حوصلہ افزائی فرمائی، ساتھ ہی بڑے دُکھ کے ساتھ لکھا، "اتنی اچھی کتاب اور اتنی خراب کتابت وطباعت، اس کا دوسرا ایڈیشن جلد چھپوائیے"۔ افسوس کہ اب تک اس کی نوبت نہ آئی۔ ۱۹۶۳ء میں جب نگار کے نیاز نمبر کا ڈول ڈالا تھا، اُس وقت بھی، اُن کا پورا تعاون مجھے حاصل تھا، اپنے مضمون میں قمر زمانی بیگم کی داستان بھی سب سے پہلے اُنہی نے چھیڑی تھی۔ لیکن نیاز صاحب چونکہ اس داستان کو مکمل صورت میں شائع کرانے کے حق میں نہ تھے، اس لئے مالک رام صاحب کے مضمون سے اس

حصّے کو حذف کرنا پڑا۔

مالک رام کی تحریروں سے استفادہ ایک عرصے سے کر رہا ہوں۔ اُن کی کتابوں میں عورت اور اسلام' اور ذکرِ غالب روزِ اوّل سے میرے دل و دماغ پر غالب رہیں اور میں اُن کے تبحرِ علمی، دقّتِ نظر اور توازنِ فکر کا قائل رہا، اُن کے نام اور کام کو ذہن میں کبھی اُبھارتا تو ایک بھرکم شخصیت کا تصوّر قائم ہوتا، ملاقات ہوئی تو اوسط کیا، چھوٹے قد کی، دُبلی پتلی، شیروانی اور ٹوپی میں خالص مشرقی انداز کی ایک سادہ وضع شخصیت میرے سامنے تھی، سعدی کے قول "ہر کہ بہ قامت کہتر بقیمت بہتر" پر ایمان لے آیا۔ سمجھ میں آگیا کہ طور کی چھوٹی سی پہاڑی، ہمالیہ سے تو قیر و منزلت میں کیوں زیادہ ہے، گھر پہنچ کر اُس کی قدر و قیمت کچھ اور بڑھ گئی، مالک رام صاحب کا ڈرائنگ روم کیا ہے، ایک بے ڈھنگم لائبریری ہال ہے، صوفے، قالین کرسیاں، میزیں، آرائش و زیبائش کا سامان، اس میں کیا کچھ نہیں ہے، لیکن سب کی سب چیزیں، کتابوں کی چھاؤں بلکہ دباؤ، میں ہیں، یعنی اُن کی حیثیت ثانوی ہے، کتابیں اُن پر فائق ہیں۔ درجنوں کتابیں کھلی ادھ کھلی میز پر لگی ہیں، کچھ نیچے پڑی ہیں، کچھ دائیں، کچھ بائیں، چھوٹی میزوں پر رکھی ہیں، کمرے میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس میں جو کتابیں ہیں، وہ کمرے کی سجاوٹ یا آنے والوں پر رُعب جمانے کے لئے نہیں، مطالعے کے لئے ہیں۔

مالک رام صاحب اس وقت پچھتر کے لپیٹ میں ہیں، لیکن کام کرنے کی لگن میں فرق نہیں آیا۔ خود بھی کام کرتے ہیں دوسروں کو بھی ترغیب دیتے ہیں، شاید ہی کوئی ایسا علمی و ادبی ادارہ ہوگا جس کی رہنمائی میں اُن کا ہاتھ نہ ہو، غالب انسٹی ٹیوٹ ترقی اُردو بورڈ، ساہتیہ اکیڈمی، انجمن ترقی اُردو، غالب اکیڈمی، جامعات کے لسانی شعبے، سبھی اپنے پروگراموں میں اُن کے مشوروں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اُن میں زبان و ادب کی خدمت کا ایسا جذبہ ہے کہ اپنی صحت کی قیمت پر کام کرتے ہیں اور پورے ولولے اور خندہ پیشانی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ترقی اُردو بورڈ دہلی چار جلدوں میں اُردو لغت تیار کر رہا ہے، اس کی ایک

ر مالک رام صاحب کے سپرد ہے، چنانچہ اُسی کے تکملے میں لگے ہوئے ہیں۔ دوسرے کام بھی بند
ی ہیں۔ "معاصرین" کے نام سے ہمعصر ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں تین جلدیں آ چکی ہیں۔
تھی اور پانچویں جلد تکمیل کے مرحلے میں ہیں، "تحریر" سہ ماہی کے پرچے اور خاص نمبر اس پر
ستزاد ہیں، بعض پُرانی کتابوں پر نظرِ ثانی کا کام بھی جاری ہے، ایک جامع ادبی ڈکشنری بھی
یرِ ترتیب ہے۔ اُن کے مطبوعہ کلام اور آئندہ منصوبے کی تفصیل سُن کر اُن کی صحت و سلامتی
ے لئے دل سے دُعائیں نکلیں، اللہ تعالیٰ انھیں تا دیر زندہ رکھے۔

باتوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ بیگم صاحبہ نے کہا، اب کھانا کھا لیجئے۔ ڈرائنگ رُوم سے
لحق کھانے کی میز تھی۔ مالک رام، بیگم صاحبہ، اور بیٹی بُشریٰ، سب، ساتھ بیٹھ گئے۔
لک رام صاحب کی نفاستِ طبع اور سادگیٔ مزاج، یہاں بھی دیکھنے میں آئی، چھوٹے دائروں کی
ریک تازہ روٹیاں، قلیے کہہ لیجئے، گوشت، کباب، دو تین طرح کی سبزیاں، چٹنیاں، دہی،
چاول، کھیر، روزمرہ استعمال کئے جانے والے اسٹینلس کے شفاف برتنوں میں، اشتہا انگیز
ابت ہوتے۔ اس نوع کا کھانا اور بالکل گھریلو فضا میں، بہت دنوں میں میسّر آیا، کھانے
ے بعد، ذرا دیر میں چائے بھی آ گئی، اب مالک رام اُٹھے، اور تحریر سہ ماہی کے تقریباً
سارے پرچے نکال لائے، سامنے ڈال دیئے، میں انھیں دیکھ ہی رہا تھا کہ انھوں نے
اپنی ساری کتابوں کا ایک ایک نسخہ ڈھونڈ نکالا، تذکرۂ مالک رام، مرتبہ عابد حسین کی تین جلدیں
مزید تھیں، شام کو پانچ بجے چلتے وقت یہ ساری کتابیں، گراں قدر تحفے کے طور پر میرے
حوالے کر دیں۔ میں نے خاموشی سے قبول کیں، کہ یہ موقع میری نگاہ میں اظہارِ تشکر کی روایت
سے بہت بلند و بالا تھا۔

پُر تپاک عشائیہ

مالک رام صاحب کے گھر سے ۶½ بجے کے قریب، ڈاکٹر خلیق انجم صاحب
مجھے واپس لے گئے۔ پروگرام کے مُطابق آج یہاں دعوتِ خاص بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ
پُر تپاک عشائیے کا اہتمام تھا، میری توقیر بڑھانے کے لئے دلّی کے ممتاز ادیبوں میں سے
بہتوں کو کھانے پر بُلایا گیا تھا۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، کرنل بشیر حسین زیدی، مالک رام،
عتیق صدیقی، منیر احمد شیخ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، بیگم نارنگ، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی،

شہباز حسین، ڈاکٹر ظہیر صدیقی، رفعت سروش، شان الحق حقی، اور عبدالصمد خاں بھی بطورِ خاص مدعو تھے ۔ ایک دو کے سوا، سبھی نے، اس دعوت میں شرکت کی ۔ مختلف موضوعات پر دیر تک سلسلۂ گفتگو جاری رہا ۔ کبھی حد درجہ سنجیدہ، کبھی ہلکا پھلکا، کبھی قہقہہ انگیز اور کبھی تبسم ریز ۔ ایسی فضا میں کھانے پلیٹیں سب کے ہاتھوں میں آگئیں، موہنی انجم کی مہمان نوازی اور مہارتِ طعام سازی کا ذکر اس سے پہلے بھی کر چکا ہوں، آج اس مہارت و مہمان نوازی کا نقطۂ عروج دیکھنے میں آیا ۔ کسی کو کھانے کی میز تک زحمت کرنے یا "کوتاہ دستی" سے کام لینے کا موقع نہ تھا ۔ ہر چیز ہر شخص کی پلیٹ میں، بہ اصرار ڈالی جا رہی تھی ۔ اور ایسے حُسنِ اخلاق اور حُسنِ کلام کے ساتھ کہ خوردن برائے زیستن کے بجائے" زیستن برائے خوردن پر کاربند ہونا پڑا ۔ کھانے میں سبھی چیزیں اچھی تھیں لیکن "شاہی ٹکڑے" اور "کشمیری پالک" کی بات ہی کچھ اور تھی، ہر ایک نے اُن کی دل کھول کر داد دی، یہاں تک کہ کشمیری پالک کو مُرغ پر مرجّح ٹھہرایا ۔ کھانے کے بعد چائے، کافی، میوہ ہائے خشک وتر، اور تصویر کشی کے دَور چلے، عبدالصمد خاں، شان الحق حقی، خلیق انجم اور رشید حسن سبھی نے اپنے اپنے ہاتھ دکھائے ۔ ۱۱½ بجے رات کے قریب یہ دلچسپ اور پُر کیف محفل برخاست ہوئی ۔ اور میرے بھارت کے سفر کا ایک یادگاری نقطہ بن گئی ۔ (باقی)

ڈاکٹر محمود حسین

تعلیم کی نظریاتی بنیادیں

یہ بات کہ پاکستان ایک نظریاتی (آئیڈیولاجیکل) مملکت ہے یا یہ کہ اسے ایک نظریاتی مملکت ہونا چاہیئے۔ شاید ہم میں سے اکثر کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ لیکن کیا ہمارے ذہنوں میں یہ بات بھی واضح ہے کہ نظریاتی مملکت کا مفہوم کیا ہے؟ بعض لوگ خصوصاً جمہوری ممالک میں لفظ آئیڈیالوجی سے بدکتے ہیں۔ جرمنی میں ہٹلر کے برسراقتدار آنے کے بعد یہ لفظ خاصا بدنام ہوا۔ مگر اس لفظ سے گھبرانے کی کوئی خاص وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ آئیڈیالوجی کے لفظی معنی ہیں علم تصورات یا علم نظریات اور اصطلاحی معنی ہیں ایسا مربوط فلسفۂ حیات جس پر عمل پیرا ہونا کسی جماعت یا مملکت کا مقصد ہو، اس تصور کی وضاحت اور اس کے علمی جائزے کی سب سے زیادہ ذمہ داری قوم کے ان لوگوں پر عاید ہوتی ہے جنھوں نے اپنے کو تعلیم کے کام سے وابستہ کر رکھا ہے۔ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کا یہ فرض ہے کہ وہ نظریاتی مملکت کے تصور کی مناسب توضیح و تشریح کریں تاکہ اس عظیم تصور سے وابستہ قومی جذبات تعمیری کوششوں کا حصہ بن سکیں۔

تعلیم سے متعلق لوگوں کی یہ خصوصی ذمہ داری اس بنا پر ہے کہ جب تک نظریاتی مملکت کا تصور قوم کی آئندہ نسل کی تربیت کرنے والوں کے ذہن و دماغ کی آماجگاہ نہیں بنتا۔ ہماری تمام تر آرزوؤں کے باوجود نظریاتی مملکت کی عملی ترویج کے کوئی امکان پیدا نہیں ہوسکتے۔ ہم بغیر تعلیمی مساعی کے معاشرے کو وہ نظریاتی ڈھنگ نہیں دے سکتے جو ہمارے تمناؤں کا محور ہیں۔

تعلیم کی ماہیت پر نظر ڈالیئے تو یہی احساس ہوگا کہ تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے جس کا سب سے اہم کام یہی ہے کہ جس معاشرے سے وابستہ ہے اسے زندہ رکھے اور اس کی ترقی کے

سامان پیدا کرے۔ بقا و ترقی معاشرتی زندگی کے دو بنیادی وظائف ہیں اور یہ دونوں اپنے تسلسل و تکمیل کے لئے تعلیم کے رہینِ منت ہیں۔ تعلیم ہی معاشرتی زندگی کو ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچاتی اور بدلتے ہوئے حالات میں معاشرہ کی تعمیرِ نو کا اہتمام کرتی ہے۔ تعلیم ہی کے ذریعہ معاشرہ اپنے مخصوص رنگ و مزاج کو اپنے اندر جاری وساری رکھتا ہے اور اس کی ترویج کا سامان پیدا کرتا ہے۔ ہمارے ملک میں جب تک تعلیم کا کام کرنے والوں اور - - - - - - - - - - - - - - -

خاص طور پر ہمارے اساتذہ کے ذہنوں میں نظریاتی مملکت کا تصور واضح نہیں ہوتا، جب تک انھیں اس قومی و ملی مزاج سے واقفیت نہیں ہوتی جو ہمارا نشان امتیاز ہیں اور جو ہمیں دوسرے معاشروں سے ممیز کرتے ہیں۔ ہماری تعلیم اپنے مخصوص انفرادی رنگ سے محروم رہے گی اور ہماری تہذیبی و تمدنی شخصیت کے خدوخال واضح نہیں ہوسکیں گے۔ ہم میں سے ہر ایک کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ نظریاتی مملکت کے تصور کا پوری طرح جائزہ لے۔ اس کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں کو ذہن میں اُجاگر کرے اور ٹھنڈے دل سے اس کے تعلیمی امکانات کا جائزہ لے۔

آج کی اس مجلس میں نظریاتی مملکت کے تصور پر سیر حاصل بحث تو ممکن نہیں لیکن میں یہ ضرور چاہوں گا کہ تعلیمی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر جو کچھ میں نے سوچا ہے اسے انتہائی مختصر طور پر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ تعلیم ایک معاشرتی عمل ہے اس لئے بات کی ابتدا معاشرہ کی بنیادی ماہیت سے کرنا زیادہ مناسب ہوگی۔ معاشرہ یوں تو ان گوناگوں تمدنی مظاہر پر مشتمل ہوتا ہے جو ہمیں نظر آتے ہیں اور جن کا ہم تجربہ کرتے رہتے ہیں لیکن بنیادی طور پر معاشرے کے تانے بانے کو قائم رکھنے والا جذبات و احساسات کا وہ نظام ہے جو معاشرے کے افراد میں موجزن رہتا ہے اور ان کو ایک دوسرے سے منسلک رکھتا ہے۔ ہر فرد کے جذبات بعض اہم حیثیتوں سے معاشرے میں رہنے والے دوسرے افراد کے مماثل ہوتے ہیں۔ اگر ہم میں یہ بنیادی جذباتی یکسانیت نہ ہو تو معاشرہ میں وہ جذبات باہم ختم ہوجائے گا جو اسے قائم و دائم رکھتا ہے۔ انہی مشترک جذبات کو معروضی اصطلاح میں قدر کہا جاتا ہے اور کوئی معاشرتی زندگی قدروں کے ایک مخصوص نظام کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ قدروں کا مخصوص

نظام ہی معاشرہ کو اس کے منفرد خد و خال عطا کرتا ہے اور انہی قدروں سے معاشرہ کی نظریاتی تشکیل ہوتی ہے۔ تعلیم کا بنیادی فریضہ دراصل یہی ہے کہ معاشرتی زندگی میں قدروں کو زندہ و جاری رکھے۔ اور ان اقتدار کی ترقی وارتقار کے سامان پیدا کرے۔ پاکستانی معاشرہ بھی قدروں کے ایک مخصوص نظام پر مشتمل ہے اور اس معاشرہ کی صحت و پائیداری کے لئے یہ ضروری ہے کہ تعلیم ہمارے اندر جذباتی یگانگت کی پرورش و ترویج کا وسیلہ بنے اور ہماری معاشرتی قدروں کے فروغ وارتقا کا اہتمام کرے۔

اگر یہ بات صحیح ہے کہ پاکستان کی تعلیم کا بنیادی فریضہ ہماری مختلف قدروں کی آبیاری و چمن بندی ہے تو پھر تعلیم کے نقطۂ نگاہ سے دوسرا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہماری نظریاتی وحدت کا دائرہ کس قدر وسیع ہونا چاہیئے۔ اس سوال کی تعلیمی اہمیت اس بنا پر ہے کہ لوگوں کے درمیان جذبات واحساسات کی یگانگت کئی سطحوں پر نظر آتی ہے مثلاً خاندان کے افراد کے درمیان ایک خاص زبان بولنے والوں میں یا صوبائی اور ملکی سطح پر جذباتی یگانگت۔ سوال یہ ہے کہ تعلیم کو کس سطح پر جذباتی یگانگت یا قدروں کے نظام کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے مقاصد کا تعین کرنا چاہیئے۔ شاید یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں کہ تعلیم کے مقاصد کی حدبندی جتنی نچلی سطح پر کی جائے گی اتنا ہی تعلیم کا دائرۂ اثر محدود ہوگا۔ تعلیمی لحاظ سے کوشش تو یہ ہونی چاہیئے کہ مختلف سطحوں پر قدروں میں ہم آہنگی رہے لیکن تعلیمی مقاصد میں خود اپنی جگہ اتنی وسعت ہونا چاہیئے کہ ایک خاص معاشرتی مزاج رکھنے والے زیادہ سے زیادہ افراد کو سمویا جاسکے۔ مثلاً میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ تعلیم کے مقاصد کو متعین کرنے میں ہم کو اپنے کو ملکی سطح تک بھی محدود نہیں رکھنا چاہیئے۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ ہماری تعلیم کا مقصد یہ نہ ہونا چاہیئے کہ اچھے پاکستانی پیدا ہوں، لیکن اچھے پاکستانی کے تصور میں بھی مزید وسعت کی ضرورت ہے تعلیم کے مقاصد کو متعین کرنے کے لئے شاید صحیح وحدت یا اکائی وہ ہوگی جسے تاریخ کے طالب علم تہذیب کہتے ہیں ہماری تعلیم کو اس تہذیب کا آئینہ دار ہونا چاہیئے جو ہماری زندگی کا اصل ماخذ ہے۔ میری مراد اسلامی تہذیب سے ہے۔ اس دنیا کے مختلف چشموں میں ایک اہم دھارا وہ ہے جسے

تہذیب اسلام کا نام دینا چاہئے۔ یہی تاریخی سرچشمہ اس تہذیبی و معاشرتی قدروں کا ماخذ ہے جن کے ہم وارث ہیں اور جو ہمیں دوسروں سے نمایاں کرتی ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ آپ اس وقت یہ کہہ بیٹھیں کہ تعلیم صرف اسلامی تہذیب ہی تک کیوں محدود رہے، کیوں نہ ہم آفاقی و عالمگیر قدروں کو اپنائیں۔ اول تو یہ کہ اسلام کا پیغام اور نظام حیات خود آفاقی و عالمگیر ہے لیکن اس سے قطع نظر آپ کی یہ آرزو تعلیمی افق کو اس قدر وسیع کر دے گی کہ تعلیم کا کام کرنے والوں کے لئے عملی طور پر اس کا احاطہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ دیسے یہ بات ضرور واضح کر دینا چاہئے کہ اسلامی تہذیب سے تعلیمی وابستگی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دوسرے معاشروں اور تہذیبوں سے آپنے کو الگ تھلک کر لیا جائے۔ دوسری تہذیبوں کے مطالعہ سے خود ہمیں اپنے آپ کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملتی اور ہمارا تہذیبی دامن مالا مال ہوتا ہے اور ہمیں تو ہماری اپنی تعلیمات دوسروں کی اچھی باتوں کو اپنانے کا سبق دیتی ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے لئے آفاقیت کی منزل کا راستہ خود ہماری اپنی تہذیب یا اپنی تہذیب کے واسطہ سے ہونا چاہئے۔ بین الاقوامی شخصیت مزاج کی شرط اول یہی ہے کہ ہم خود اپنی تہذیب کا اچھا نمونہ ہوں۔ یہ سمجھنا کہ اپنی تہذیب سے وفاداری بین الاقوامیت کی نفی کرتا ہے درست نہیں۔ اس قسم کے وسوسوں کا مطلب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ ہم خود اپنی اسلامی تہذیب سے اور اس کی آفاقی روح اور پیغام سے پورے طور پر واقف نہیں۔

بعض دوسرے لوگوں کے ذہن میں شاید یہ سوال اٹھتا ہو کہ اسلامی تہذیب کی اقدار عالیہ موجودہ دور کے تقاضوں سے کیسے ہم آہنگ ہو سکیں گی۔ تعلیم کو ان قدروں کا ترجمان بنانے کے بعد جو تعلیمی ماحول پیدا ہو گا وہ ٹیلی ویژن، ہوائی جہاز، جوہری توانائی اور اقوام متحدہ کی اس بیسویں صدی کے ماحول سے کیسے مطابقت حاصل کر سکے گا۔ لیکن میرا جواب صرف یہ ہو گا کہ جن انسانی مسائل سے ہم بیسویں صدی میں نبرد آزما ہیں ان کی تاریخ اس صدی سے کہیں زیادہ پرانی ہے۔ ان مسائل کو شدت کو بیسویں صدی نے تیز ضرور کر دیا ہے لیکن ان مسائل کو اس صدی نے پیدا نہیں کیا ہے۔ تعلیم کی نظریاتی بنیادوں میں بیسویں صدی کی تیز رفتاری نے کوئی تبدیلی یا [illegible] نہیں کیا ہے۔ اور بنیادی طور پر فلسفۂ تعلیم کے مسائل اب بھی

ہی ہیں جو اس صدی سے پہلے تھے۔

اِن دو باتوں سے قطع نظر خود صحیح تعلیم کا یہی تقاضہ ہے کہ انسان کو اس کے اپنے ماحول اور اس کے اپنے تہذیبی مزاج کے مطابق تعلیم دی جائے۔ جس ماحول میں ہم نے آنکھ کھولی ہے، جس تمدن کے ہم پروردہ ہیں، جو جذبات ہمارے اندر موجزن ہیں، وہی ہماری ذہنی و جذباتی تربیت کا بھی بہتر وسیلہ بن سکتے ہیں۔ مانگے کے خیالات اور مستعار آرزوئیں ہمیں ذہنی طور پر بھک منگا اور نقال تو بنا سکتی ہیں لیکن ہمارے اندر ان تخلیقی قوتوں کو بیدار کرنے اور جلا دینے سے قاصر رہیں گی جو صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ آدمی کا زاد راہ ہوتی ہیں۔ ہمارا اپنا تہذیبی ماحول ہی ہمیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے اور ہماری شخصیت کو منفرد بناتا ہے۔ اگر ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری تہذیب صحت مند روایتوں کی امین ہے، اگر ہمارا یہ احساس ہے کہ ہمارے اخلاقی و معاشرتی ضابطوں، سوچنے سمجھنے کے انداز، جذبات و احساسات، آرزوؤں اور اُمنگوں کو زندہ رہنا چاہیئے تو پھر اسلامی تہذیبی قدروں سے ہماری تعلیمی وابستگی ناگزیر ہے۔ تعلیم ہی کے ذریعہ تہذیبیں زندہ رہتی ہیں اور تعلیم ہی ان کے تسلسل و ترقی کا اہتمام کرتی ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے کہ نظریاتی مملکت کے قیام و بقا کے لئے ہماری تعلیم کا اسلامی تہذیبی قدروں سے سیراب ہونا ضروری ہے تو پھر تعلیم کا کام کرنے والوں کے سامنے سب سے اہم سوال یہی ہے کہ وہ کونسی قدریں ہیں جو ہماری تہذیب کی آئینہ دار ہیں اور ان کو تعلیمی نظام میں سمونے کا کیا لائحہ عمل ہونا چاہیئے، اس موقع پر قدروں کی متنوع قسموں یعنی مادی، علمی، سیاسی، معاشرتی وغیرہ کو گنوانے کے بجائے میں صرف اس قدر کا تذکرہ کروں گا جس سے دوسری تمام قدریں توانائی و قوت حاصل کرتی ہیں، اور جو انہیں باہم مربوط و متحد کرتی ہے میری مراد مذہبی قدر سے ہے۔ ہماری تہذیب کا امتیازی نشان ہمارا مذہب ہے۔ یہ مذہب ہمارے لئے ایک الگ تھلک مشغلہ نہیں ہے بلکہ زندگی گذارنے کا طریقہ ہے۔ یہ ہمارے تمام مشاغل اور اعمال پر حاوی ہے۔ تہذیب بجائے خود ہماری زندگی ہے، ہماری تمام مادی و روحانی قدروں، اخلاقی ضابطوں، اعمال حسنہ کا ماخذ اور آخری جواز مذہب ہی ہے۔ اس لئے ہمارا تعلیمی مسئلہ محض یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے نصاب میں مذہبی تعلیم کا انتظام کر دیں اور

اسلامیات کے مضمون کو ہر تعلیمی سطح پر لازمی کر دیں، بلکہ یہ کہ ہمارا پورا کا پورا نصاب، سارا تعلیمی ماحول مذہبی قدروں سے سرشار ہو۔ محض دینیات ہی نہیں بلکہ سارے تعلیمی نصاب کو بچوں کے اندر مذہبی مزاج کی ترویج کا ذریعہ بنانا ہوگا۔ مذہبی مزاج ہی ہماری نسلوں کو اس اخلاقی خود مختاری اور متانت سے بہرہ مند کرے گا جن سے وہ اس دُنیا میں خدا کی خلافت کی سزاوار بن سکیں گی۔ تعلیم کی اس نہج پر ترویج صحیح معنوں میں نظریاتی مملکت کو جنم دے گی اور ہمارا تعلیمی نظام اس مملکت کے فروغ و ترقی کا ضامن بن سکے گا۔

مجتبیٰ حسین

تحقیق سے تخلیق تک

کراچی کی ایک ادبی نشست میں ایک بزرگ جو نہایت علم دوست اور ادب نواز ہیں ۔ اُردو ادب کی موجودہ صورتِ حال پر تشویش کا اظہار فرما رہے تھے ان کے خیال میں اُردو ادب برسوں سے یعنی گذشتہ بیس پچیس سال سے نہایت چھوٹے درجے کی چیزیں پیش کر رہا ہے ۔ ناول، ڈرامے، افسانے، غزلیں، نظمیں، ادبی تنقیدیں بہت لکھی جا چکی ہیں اور اب ضرورت ہے کہ ان ہلکی پھلکی چیزوں سے ہٹ کر دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے کئے جائیں ۔ ادب پر تحقیقی کتابیں لکھی جائیں۔ اور علمی اور فنی کتابوں کی تصنیف کی طرف توجہ دی جائے تاکہ اُردو ادب میں ٹھوس اور سنجیدہ کام ہو سکے ۔

یہ رائے بظاہر بڑی صائب معلوم ہوتی ہے ۔ مگر کس حد تک صائب ہے ۔ آپ اس کا اندازہ بڑی آسانی سے لگا سکتے ہیں ۔ ان تمام سر برآوردہ ناموں کی ایک طویل فہرست مرتب کر لیجئے ۔ جنھوں نے ترجموں، تحقیق اور ٹھوس علمی اور فنی کتابوں سے اُردو کے دامن کو مالا مال کیا ہے ۔ ان کے علاوہ ان بہت سے معلموں کے نام بھی شامل کر لیجئے (اگر یاد ہوں) جو مدتوں سے اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں درجوں کے نصابوں کے لئے معاشیات، تاریخ، فلسفہ، نفسیات، مذہبیات، جنسیات، اور سائنس پر ہزاروں کتابیں، ترجمہ، تالیف اور

تصنیف کرتے آئے ہیں۔ اس کے بعد ان چند ناموں کی بھی ایک نہایت مختصر فہرست مرتب کر لیجئے جنھوں نے ہمیں "ہلکا پھلکا" ادب دیا ہے۔ اول الذکر فہرست کے ناموں کو یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ یہ نام بڑے قابلِ احترام ہیں اور ممکن ہے موخرالذکر فہرست کے ناموں کے سامنے انھیں رکھنے سے ان کی قدر و منزلت کو صدمہ پہنچے۔ لہٰذا دوسری فہرست کے صرف چند ناموں کو دیکھئے۔ میرؔ، سوداؔ، نظیرؔ، آتشؔ، مومنؔ، غالبؔ، انیسؔ، اقبالؔ، جوشؔ، آزادؔ، حالیؔ، شبلیؔ، سرشارؔ، رسواؔ، پریم چند۔

اب سوچئے کہ اگر ان ناموں کو ہم اردو ادب کی فہرست سے خارج کردیں تو اردو ادب ہی نہیں اردو زبان میں کیا رہ جاتا ہے؟ دراصل اردو زبان کے دامن کو "مالا مال" کرنے کی بات کو اردو ادب کی بحث خلط ملط کرنے کا نتیجہ ہی ہوتا ہے۔ ترجموں کی ضرورت اور اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی زبان کا بھی ادب ہو، اس کی عظمت کا احساس دوسری زبانوں کے ادب کے ترجموں سے نہیں بلکہ اس کے اپنے تخلیقی ادب سے ہوتا ہے۔ تحقیقی ادب کا معاملہ بھی کچھ اس سے مختلف نہیں ہے۔ آزاد کے یہاں سنِ ولادت اور سنِ وفات اور بعض واقعات کی غلطیوں کی طرف توجہ دلانے والوں نے بڑا نیک کام کیا ہے۔ مگر صاحب "گلِ رعنا"، ادب کی اس صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ جس میں آج کا کوئی نیا لکھنے والا بھی کھڑا ہونا شاید پسند نہ کرے۔ شعرالعجم اور تنقیدِ شعرالعجم دونوں ناموں کو یاد کیجئے۔ (موخرالذکر نام غالباً آپ کو جلد یاد نہ آئے) اور آپ کو محمود شیرانی کا حشر معلوم ہو جائے گا۔ قاضی عبدالودود صاحب بڑے عالم فاضل بزرگ ہیں۔ مگر ہماری شدید محرومی اور بدقسمتی ہے کہ اردو کے ننانوے فیصدی قاری ان کے نام سے واقف نہیں ہیں۔ یہ سراسر ہماری کم علمی کی دلیل ہے۔ لیکن اس میں یکسر ہمارا قصور نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ادب کے چند مخصوص شعبے

ہوتے ہیں (قواعد، عروض، لسانیات اور ریسرچ سے متعلق) جن سے صرف ماہرین
کو دلچسپی ہوتی ہے اور وہ عام لوگوں کی دلچسپی کا باعث نہیں ہوسکتے یہ ماہرین
"ستائش کی تمنا" اور صلہ کی پروا" سے بے نیاز ہوکر خاموشی کے ساتھ اپنے
کام میں منہمک رہتے ہیں۔ اور ان کے نا دیدہ ہاتھ اردو ادب کی بنیاد کو
پختہ تر کرتے رہتے ہیں۔ یہ تمام باتیں اپنی جگہ درست ہیں لیکن ان ناموں
سے ادب کے عام قاری کی عدم دلچسپی اور عدم واقفیت کا سبب یہی نہیں
ہے۔ آزاد، حالی، شبلی، بڑے عالم فاضل بزرگوں سے تھے مگر ادب کے
عام قاری انھیں اپنے سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟
جب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں تو چند باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔
آزاد، حالی اور شبلی ادیب ہوکر ادب کے بارے میں سوچتے تھے۔ یہ تحقیق
اور تنقید کی طرف اس لئے نہیں آئے تھے کہ انھیں بعض شعرار کی صحیح تاریخ
وفات معلوم کرنا تھی۔ حالی نے مقدمہ شعر وشاعری، ادب سے باہر رہ کر
نہیں لکھا ہے۔ بلکہ ادب ہی میں رہ کر ادب ہی کے لئے لکھا ہے۔ "آب حیات"
ادب کی حیثیت سے معتبر کتاب ہے جب کہ "گل رعنا" غیر معتبر۔ شعر العجم کا مطالعہ
صرف تذکرے کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ شعر ذوق کی تعمیر بھی ہے۔ شعر العجم
خوش ذوقی کی طرف لے جاتی ہے اور تنقید شعر العجم کا تعلق شعری ذوق
کی ترتیب سے مطلقاً نہیں ہے مقدمۂ شعر وشاعری باقی ہے۔ ادھر پنج کے
اعتراضات کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ دراصل آزاد، حالی اور شبلی خالق
ادب ہیں۔ تحقیقی ادب ان کے ادب کا محتاج ہے۔ یہ تحقیقی ادب کے
محتاج نہیں۔
دوسری بات یہ ہے کہ یہ بڑی شخصیتیں ہیں۔ ہمارے ادبی محققین اپنی تمام قوت
نظر کے باوصف بڑی شخصیت تو درکنار ابھی معتبر ادبی شخصیت بھی نہیں بن پاتے
اور تیسری بات یہ بھی ہے کہ غالب کو یاد رکھنے اور قاضی عبدالودود کو بھول جانے میں

چنداں ہرج نہیں ۔ لیکن غالب کو یاد رکھنا اور حالی کو بھول جانا یقیناً ادبی ارتقاء
سے بے خبری ہوگی ۔ پنجاب میں اُردو، دکن میں اُردو بڑی مفید کتابیں ہیں ۔
ہماری بدقسمتی سے یہ ادبی کتابیں بمشکل ہی ثابت ہوتی ہیں اس لئے ادب سے
بیگانہ ہوکر صرف ادبی تحقیق کو ادب کی خدمت سمجھ لینا اور اس کے بعد ناقدر
زمانہ یا اُردو ادب کی شکایت کرنا تقریباً ایسی ہی بات ہوئی جیسے ہم اد
کے قاری سے یہ مطالبہ کریں کہ وہ جنتری کا بڑے غور و خوض سے مطالعہ کیا کر
اور جب وہ گریز کرے تو ہم اُسے "ہلکے پھلکے" ادب کا دلدادہ کہہ کر نا قا
اعتنا سمجھ لیں ۔ عام پڑھنے والوں سے بے اعتنائی (عام پڑھنے والوں سے
مُراد ادب کے طالب علم ہیں) اور ان کے ترقی پذیر ذوق سے بے خبری اُ
دوستی نہیں ۔ اُردو دشمنی ہے ۔ اُردو کی توسیع اور ترویج زندہ ادب د
اور عام پڑھنے والوں کے ذوقِ ادب کی تشفی کئے بغیر ممکن نہیں، چنانچہ
دیکھتے ہیں کہ جن کا سرمایہ صرف تحقیق رہا ہے وہ ادب پر کوئی خوشگوار اثر
تک نہیں چھوڑ سکے ہیں ۔ اور ان کا علم و فضل اُردو کے لئے کوئی فیضان کا
بن سکا ۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو توسیع اور اس کو پُر مایہ بنانے میں (کیا بلح
زبان کیا بلحاظِ ادب) ان کا دخل کم رہا ہے ۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس تمام بحث کا نیاز صاحب سے کیا تعلق
لیکن اگر آپ اس بحث کے (جو نہایت تشنہ اور مختصر ہے) پس منظر کو پیشِ نظ
تو آپ کو اس میں نیاز صاحب کی شخصیت اپنے مختلف پیچ و خم کے ساتھ ابھ
نظر آئے گی ۔ ادب میں نیاز صاحب کے مرتبے کے تعین کے لئے یہ بحث
ہے اس کے بغیر وہ منفرد مقام جہاں آج وہ کھڑے ہیں واضح طور پر نہیں
نظر نہ آسکے ۔ آئیے اب ذرا اس پر غور کریں کہ اُردو ادب میں آج وہ کون
افراد ہیں جو تحقیقی ادب اور تخلیقی ادب دونوں میں یکساں طور پر احترام
سے دیکھے جاتے ہیں ۔ ان افراد کے نام آپ دل میں دہراتے جائیے او

پ کو معلوم ہو گا کہ نیاز صاحب اس دور کے وہ واحد آدمی ہیں جنہوں نے اریخی اور تحقیقی ادب پر قلم اٹھانے کے ساتھ ساتھ ہمیں اُردو کا وہ ادب بھی یا جس میں اپنے زمانے کے فکری رجحانات کو سمجھنے، پرکھنے اور پیش کرنے کا حوصلہ بھی پایا جاتا ہے ۔ ان کا ایک قدم تحقیق کے دائرے میں ہے اور دوسرا تخلیق کے دائرے میں ۔ یہ بڑی بات ہے ۔ جو آج اُردو کے شاید ہی کسی ادیب میں پائی جاتی ہے ۔

نیاز صاحب کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ نرے "محقق نہیں بن گئے ۔ اگر انہوں نے چند تاریخی، علمی اور تحقیقی مقالے لکھنے ہی پر اکتفا کر لیا ہوتا تو وہ ایک ادبی شخصیت کی حیثیت سے اتنے معتبر اور دلکش نظر نہ آتے، یہ اور بات ہے کہ خود نیاز صاحب اب اُردو کی بقاء اور توسیع کے لئے ترجموں اور تحقیقی ادب کے نسخے تجویز کرنے لگے ہیں بلکہ اب تو وہ نامِ خدا فقہ کی وادی پر خار میں بھی قدم دھرتے نظر آتے ہیں ۔ ادھر کئی سال سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیاز صاحب دو حصّوں میں بٹ چکے ہیں ۔ ایک نیاز ادب سے وابستہ ہے ۔ دوسرا ادب سے گریزاں ۔ ایک ادب کی عظمت کا مقر ہے ۔ دوسرا منکر ۔ دیکھنا یہ ہے کہ دونوں میں سے کس نیاز کی شخصیت بالآخر غالب رہتی ہے ۔

نیاز صاحب کی شخصیت کی یہ اندرونی کشمکش کچھ آج کی نہیں ہے ۔ یہ ابتدار سے ان میں پائی جاتی تھی ۔ مگر پہلے یہ اتنی نمایاں اور عروج پر نہ تھی ۔ اور جو کچھ باہمی تصادم ہوتا تھا ۔ اس کا اظہار ادبی اسلوب اور ادبی اندازِ فکر لئے ہوتا تھا عبدالماجد دریاآبادی اور سلیمان ندوی سے نبرد آزمائی میں حریف ان کے جس حربے کی تاب نہ لاسکے وہ ادب ہی تھا ۔ اسی لئے نیاز صاحب کی اب ادب سے بے نیازی کچھ اچھی چیز نہیں معلوم ہوتی ۔ نیاز صاحب علمی، تاریخی اور تحقیقی مضامین سب کے سب بڑی عرق ریزی اور غور و فکر کے بعد لکھے گئے ہیں ۔ ان کو نظر انداز کرنا مشکل ہے ۔ لیکن ان کے علاوہ بھی انہوں نے بہت کچھ

لکھا ہے ۔ اور اس "بہت کچھ" کا تعلق براہِ راست ادب سے ہے ۔ اگر یہ چیز ان کے یہاں نہ پائی جاتی تو ان کے علمی مقالے ہمارے ذہن پر کچھ بہت خوشگوار اثرات نہ مرتب کرتے ۔ ان مقالوں کے پیچھے ان کی ادبی نگارشات کی سفارش ہے ۔ ان کے علمی مقالوں کے ساتھ ہی ہماری نظروں میں "نگارستان" "جمالستان" شاعر کا انجام، شہاب کی سرگذشت، اور ان کی بہت سی ادبی تنقیدیں پھر جاتی ہیں ۔ اور ان کی شخصیت بوجھل، بے کیف، بے روح، بے فیض اور جامد ہونے کی جگہ دفعتاً دِل کش، دلچسپ اور متحرک نظر آنے لگتی ہے ۔

نیاز صاحب کا ادب گذشتہ نصف صدی سے "خانہ نشیں" ہونے کی جگہ زندگی کے ہر سرد و گرم میں حصہ لیتا رہا ہے اس ادب کی آنکھیں پرانے مخطوطات کا سن تصنیف پڑھتے پڑھتے اپنی بصارت کھو نہیں بیٹھیں بلکہ ان میں بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی ملتی ہے ۔ اس میں گرد و پیش کی زندگی سے دلچسپی لینے کی اُمنگ پائی جاتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ نیاز صاحب کی تحریریں اُردو ادب کی تاریخ کو برٹش میوزم کے نقطۂ نظر سے پڑھنے پر اتنی مائل نظر نہیں آتیں ۔ جتنی وہ اسے ہزار چہرہ زندگی کے ہر آن اُبھرتے، مٹتے، بنتے، بگڑتے خدوخال میں تلاش کرتی نظر آتی ہیں ۔ نیاز صاحب کی تصانیف میں وہ آدمی نہیں ملتا جو خود نہیں سوچتا بلکہ دوسروں کے سہارے سوچتا کم ہے دیکھتا زیادہ ہے (ملاحظہ ہوں پُرانے مخطوطات) ۔

نیاز صاحب کی تحریروں کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ وہ خود بھی سوچتی معلوم ہوتی ہیں اور دوسرے کو بھی سوچنے پر تیار کرتی ہیں ۔ خواہ اسے نیاز صاحب کے خیالات سے کتنا ہی اختلاف ہے ۔ آج سے تقریباً نصف صدی کی ادبی فضا کو اپنے ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کیجئے ۔ اُردو ادب اپنے رومانی دور میں داخل ہو چکا تھا ۔ یہ ایک لحاظ سے نثر کے اس کلاسیکی دور کا ردِ عمل بھی تھا جو آزاد، حالی اور شبلی سے شروع ہوا تھا ۔ مہدی افادی، ناصر علی اور خود مولانا ابوالکلام آزاد کی خطیبانہ تحریریں ایک رومانی اندازِ فکر کی بنا ڈال رہی تھیں ۔ یلدرم نے اس رومانی فکر کو بیرونی عناصر

کی آمیزش سے اور چمکایا۔ نیاز صاحب کی فکر نے اسی فضا میں پرورش پائی۔ اس فضا میں رومان کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز بھی پروان چڑھ رہی تھی جسے جمالیات کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ جمالیاتی اندازِ فکر رومان کی ایک شاخ تھا۔ نیاز صاحب کی اس وقت کی تحریروں میں یہ دونوں عناصر بڑے رچے ہوئے انداز میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی فکر یکسر رومان اور جمالیات کی پروردہ نہیں تھی۔ اس میں معاشرتی مسائل اور انسانی رشتوں کو سمجھنے کی کوشش بھی ملتی ہے۔ اسی لئے وہ زیادہ سخت جان ثابت ہوئی۔ ان کی رومانی اور جمالیاتی تحریریں ایک لحاظ سے اس دور کے مذہبی، جنسی اور روایاتی اندازِ فکر کے خلاف اعلانِ بغاوت تھیں۔ اپنے انوکھے اسلوب کے اعتبار سے بھی اور فکر کے اعتبار سے بھی۔ لیکن نیاز صاحب کی اس تمام بغاوت کے پیچھے ہمیں مذہب کی بنیادی اقدار سے کوئی انحراف یا عداوت نہیں ملتی بلکہ رومان اور جمالیات کا رنگین نقاب ہٹا کر اگر دیکھا جائے تو ہمیں اس وقت بھی ان کی تحریروں میں ایک حسین مگر مقدس چہرہ ملتا ہے۔ نیاز صاحب ہمیں اس دور کے ایک جدید صوفی کے لباس میں نظر آتے ہیں۔ قدیم ہندوستان اور یونان کے اصنام میں انہوں نے اسلام کی روح کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیاز صاحب کی بنیادی فکر جن عناصر سے ترکیب پائی ہے ان میں مذہب اور حُسن پرستی کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اور یہ حُسن پرستی خود ایک مذہب بن کر ان کے یہاں اُبھری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آگے چل کر رفتہ رفتہ جب وہ تجربات اور پختہ فکر کی منزل سے گزرنے لگے تو ان کی حُسن پرستی سمٹ کر مذہب میں آگئی۔ اور وہ چہرہ جو ان کی تحریروں پہلے حسین اور مقدس نظر آتا تھا۔ صرف مقدس بن کر رہ گیا بلکہ اب اس کے خدوخال میں زندگی کی خشکی بھی کہیں نظر آجاتی ہے۔

بہرحال نیاز صاحب کا وہ دور جو "جمالستان" اور "نگارستان" سے شروع ہوتا ہے بڑا ہنگامہ خیز رہا ہے۔ اس دور میں وہ کئی محاذ پر لڑتے رہے اور بڑی بے جگری کے ساتھ۔ مذہب کے فرسودہ اور رسمی تصورات سے انہوں نے ٹکر لی۔

معاشرے کی تنگ نظری کے خلاف انہوں نے آواز اُٹھائی۔ تاریخ کی بے جان تاویلات کو انہوں نے ہدف بنایا۔ ادب کو نئے عنوان سے پڑھنے اور سمجھنے کی تبلیغ کے سلسلے میں انہوں نے ادبی معرکوں میں قدم رکھا۔ ان تمام محاذوں پر وہ مدّت تک لڑتے رہے اور اس طرح ان کی مجموعی جدوجہد نے اُس دَور کی آزادیٔ فکر کو آگے بڑھانے اور نڈر بنانے میں بڑا کام انجام دیا ہے۔ ان کی تحریریں کبھی طنز بن کر ہمیں چونکاتی رہیں۔ کبھی المیہ افسانوں کی صورت میں ہمارے اندر دردمندی پیدا کرتی رہیں۔ کتنے دریچے ان کی تحریروں سے کھلتے نظر آتے ہیں۔ اور ان دریچوں سے ان کی تحریریں اس وقت کے نئے لکھنے والوں کے دماغوں میں تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح در آئی تھیں۔

نیاز صاحب کی تحریروں نے آج سے نصف صدی پہلے کے بدلتے ہوئے معاشرے کا تقریباً ہر پہلو سے جائزہ لیا ہے۔ تاریخ، ادب، جنس، مذہب خواہ کسی موضوع پر وہ لکھ رہے ہوں۔ ان کی تنقیدی نظر برابر کام کرتی رہتی ہے۔ ان کی تحریروں کا غالب جوہر، غالباً تنقید نگاری کی صورت میں ابھرتا ہے۔ ادبی تنقیدوں میں انہوں نے عموماً بت شکنی سے کام لیا ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک بت کو توڑ کر انہوں نے اس کی جگہ جبس "خلیل" کو کھڑا کیا۔ وہ بعد میں علی اختر حیدر آبادی ثابت ہوا۔ نیاز صاحب کی تنقیدیں شاعر یا ادیب کی صرف فکر ہی نہیں بلکہ زبان و بیان کا بھی محاکمہ کرتی ہیں۔ اور اس طرح وہ اس بڑی کمی کو پورا کر دیتی ہیں جو ہمیں آج نئے ناقدوں میں کبھی کبھی محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے نئے ناقد تنقید کے اس فنّی شعبے سے کم واقف ہیں جہاں زبان کے حسن و قبح سے بحث کی جاتی ہے۔ نیاز صاحب نے ایک واقف کار تنقید نگار کی حیثیت سے ادب کا دونوں پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے خواہ وہ معاصرین ہوں یا نئے لکھنے والے۔ دونوں کو ان کی لغزشوں پر ٹوکنے میں کہیں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ نیاز صاحب تعریف و تنقیص دونوں میں بخل سے کام لینے کے

قائل نہیں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی زبان کا محتاط انداز اور پنہاں طنز
کی کرشمہ سازی کی بنا پر ان کی رائے دوسروں کی نظر میں تحمل سے کام لیتی معلوم
ہو۔ اُردو تنقید نگاری نے ان سے تنقید کا مدبرانہ اور ٹھہرا ہوا لہجہ سیکھا ہے۔
اس میں شک نہیں کہ نیاز صاحب کی تحریر میں جابجا ایک طرح کی خودنمائی
اور ادعا پایا جاتا ہے۔ یہ چیز ان کی شروع کی تحریروں میں زیادہ تھی۔ اب
تقریباً معدوم ہو چکی ہے۔ لیکن ان کی تحریر کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قاری
کو اپنی بات کا یقین دلاتی (CONVINCING) معلوم ہوتی ہے ان کی عبارت
میں متانت، جابجا طنز اور ایک چھپا ہوا سنجیدہ آہنگ پایا جاتا ہے۔ وہ ہر موضوع
پر یکساں چابکدستی کے ساتھ لکھنے پر قادر ہیں۔ اور ہر موضوع ان کی تحریر میں
ڈھل کر ان کی شخصیت بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس دور کے ان چند
لکھنے والوں میں سے ہیں جو اپنا ایک اسلوب رکھتے ہیں۔ نیاز صاحب کا یہ اسلوب
تحقیقی، فنی، اور علمی مضامین بھی کھپتا ہے اور ادبی اور تخلیقی مضامین کی روح سے
بھی ہم آہنگ ہے۔ بنیادی طور پر اس اسلوب میں ادبیت زیادہ ہے اور تخلیقی مزاج
کی بے کیفی اس پر غالب نہیں آسکتا۔

نیاز صاحب کے اسلوب میں "گورکنی" کی خو کم ہے اور زندگی سے دلچسپی لینے
کا حوصلہ بہت ہے۔ اسی لئے جب نیاز صاحب تحقیقی "گورکنی" کی طرف بھی آتے ہیں تو
بہت سے مردے ان کی مسیحا نفس قلم سے جی اُٹھتے ہیں۔ ان کی عبارت کا لطف
ان کا "قم باذنی" قسم کا لہجہ خشک مباحث کو بھی گوارہ بنا دیتا ہے۔ بات یہ ہے
کہ وہ ادیب پہلے ہیں اور محقق بعد کو۔ اسی لئے وہ ایسے محقق ہونے سے صاف
بچ گئے جو زندہ ادب کو بدگمانی کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ نیاز صاحب کی شخصیت
ایک وسیع احاطے کی صورت میں نظر آتی ہے۔ جس کے ایک حصے میں تحقیق
کا "کلبۂ احزاہ" بھی بنا ہے۔ مگر دوسرے حصے میں خوشنما باغات بھی ہیں۔ جہاں
صاف ہوا ملتی ہے۔ جہاں طرح طرح کے پھول کھلے ہیں۔ اور طرح طرح کی

عمارتیں ہیں ۔ یہاں مختلف قسم کے آدمیوں کی بات چیت سنائی دیتی ہے ۔ موت کا سناٹا نہیں ہے ۔ نیاز صاحب کی شخصیت کا یہ حصّہ زیادہ پرمعنی اور پائیدار ہے ۔ اگر ہم ان کے تخلیقی ادب کو بالائے طاق رکھ کر ان کی تحقیقات ہی کو ان کا اصل سرمایہ سمجھ لیں تو پھر نیاز صاحب کی شخصیت کا کوئی نقش مشکل ہی سے ہمارے ذہن میں اُبھر سکتا ہے ۔ نیاز صاحب کی شخصیت اپنے "جزو" میں نہیں "کل" میں پوری اہمیت کے ساتھ سامنے آتی ہے ۔ وہ افسانہ نگار ہیں، ناول نگار ہیں (اگر شہاب کی سرگذشت کو ناول کہا جا سکتا) وہ طنز نگار ہیں، تنقید نگار ہیں ۔ ان تمام چیزوں سے مل کر انکی شخصیت تعمیر ہوتی ہے ۔ یہ سچ ہے کہ اُردو افسانہ نگاری میں بڑا نام پریم چند کا ہے ۔ ناول نگاری میں رسوا، پریم چند، قرۃ العین حیدر (جی ہاں قرۃ العین حیدر) بڑے نام ہیں ۔ یہ سچ ہے کہ طنز نگاری میں رشید احمد صدیقی منفرد ہیں ۔ یہ بھی کچھ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ آج تنقید نگاری پختہ فکری کے لحاظ سے بہت آگے بڑھ چکی ہے ۔ مگر سوال نیاز صاحب کو الگ الگ کر کے دیکھنے کا نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر ان کی شخصیت کا جائزہ لینے کا ہے ۔ اگر ہم مجموعی طور پر ان کی شخصیت کو دیکھیں تو تحقیقی اور تخلیقی دونوں قسم کے ادب میں نیاز صاحب کی جامعیت کا دوسرا آدمی نظر نہیں آتا ۔

نیاز صاحب کی شخصیت اُردو ادب میں پہلے ایک تحریک بن کر اُبھری اور آج وہ ایک ادارے کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس لحاظ سے وہ ہمیں عبدالحق کی یاد دلاتے ہیں ۔ عبدالحق نے ہمیں انجمن ترقی اُردو دی، نیاز صاحب نے "نگار" دیا ۔ اور اسی کے ساتھ نگار میں لکھنے والوں کا ایک پورا حلقہ، اس حلقے کے بعض افراد آج اُردو ادب میں بڑی اہم جگہ رکھتے ہیں ۔ اس لحاظ سے نگار نے ہمیں زندہ ادیب دیئے ۔ دوسری حیثیت سے نیاز صاحب ہمیں عبدالحق سے بلند مقام پر نظر آتے ہیں ۔ ان کا ادبی سرمایہ بہت بڑا ہے ۔ اور نسبتاً زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے ۔

حسرت موہانی کی شخصی عظمت

حسرت کے بارے میں مولانا شبلی نعمانی کا یہ قول:

"تم آدمی ہو یا جن ۔ پہلے شاعر تھے، پھر پالی ٹیشن بنے اور اب بنیے ہو گئے"

کچھ بے جا نہیں ہے بلکہ اس میں حسرت کی زندگی کے تضادات کی طرف بڑا خوبصورت اشارہ ملتا ہے ۔

حسرت کی زندگی میں قدم قدم پر تضاد ملتا ہے ۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ قید و بند کی صعوبتوں میں گذرا مگر ان کی شاعری پر نشاط و امید کا رنگ غالب ہے ۔ ان کی ظاہری شکل وصورت بڑی سپاٹ اور بے رنگ سی تھی لیکن ان کی شاعری میں ایک خاص طرح کی شوخی اور آب و رنگ نمایاں ہے ۔ اور اسی کے ساتھ ہی یہ شاعری عارفانہ، عاشقانہ، ضاحکانہ، فاسقانہ وغیرہ مختلف خانوں میں بنی ہوئی نظر آتی ہے ۔ سیاسی زندگی میں وہ ایک بے چین رُوح کی طرح ہمیشہ اپنا مسلک تبدیل کرتے رہے ۔ ایک راسخ العقیدہ اور اپنے بقول CONSERVATIVE مسلمان ہونے کے باوجود، کمیونزم کے پُرجوش حامی اور مبلّغ تھے اور "غلبۂ آئینِ سوویت" کی پیش گوئیاں بھی فرماتے رہے ۔

ان سارے تضادات کا راز طبع حسرت کی طرفگیٔ طبع میں پوشیدہ ہے ۔ اس طرفگی نے بہت رنگ دکھائے ۔ صرف یہی نہیں کہ چکی کی مشقت کے ساتھ فکرِ سخن کی بلکہ کبھی نیشلسٹ ہوئے، کبھی کمونسٹ —— کبھی کانگریس کا ساتھ دیا اور کبھی مسلم لیگ کا —— کبھی جرنلسٹ بنے اور کبھی کھدر فروش ۔ مگر ان تمام تر تضادات اور طرفگی کے باوجود حسرت کے بے پناہ خلوص، نیک نیتی استقامت و عزیمت، عزم و لگن، بے باکی اور صداقت شعاری کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں ۔

بلاشبہ وہ ایک اچھے شاعر تھے اور غزل میں ان کی آواز صاف پہچانی جا سکتی

لیکن بہرحال وہ دوسرے درجے کے شاعر ہیں محض ان کی شاعری کو ان کی عظمت و
رت کی بنیاد بنانا درست نہیں [۱] ـــ ان کی عظمت کی بنیاد، ان کی بے ریا شخصیت
راس کے اندر چھپے ہوئے انسان کا کھرا پن ہے۔

آزادیٔ کامل کا بے پناہ جذبہ، دورانِ تعلیم ہی میں سامنے آتا ہے۔ کالج سے
ن بار کا اخراج بھی اس جذبے کے جوش و خروش کے سامنے بند نہیں باندھ سکتا۔
ں زمانے میں جب بقول سلیم احمد: "حالی کے پیرومرشد سرسید نے انگریز کلرک
ھالنے کی فیکٹری بنائی تھی۔ ... اور انگریزوں کے زیرِ سایہ انگریزوں کے دفتروں
ے لئے انگریزی بولنے والے انگریز نما شاندار بابوؤں کی ڈھلائی کا کام زور و شور
ے جاری تھا"، حسرت نے وکٹوریہ کالج، گوالیار میں ریاضی و عربی کی پروفیسر شپ
ھکرا دی ـــ ان کے بے شمار ساتھی سرکاری ملازمت سے منسلک ہونے کے بعد اپنی
اری ذہنی و علمی صلاحیتیں، انگریزی دفاتر کی فائلوں کی بھینٹ چڑھا رہے تھے، حسرت
ے مستقبل میں معاشی آسودگی کے خواب دیکھنے کے بجائے آزادیٔ کامل کی خاطر، ہر
رح کی مصلحت کوشی اور عافیت طلبی سے بے نیاز ہو کر انگریزی سامراج سے ٹکرانا
ند کیا ـــ روزانہ ایک من گیہوں پیسنا یا آٹے کے ہر سیر کے بدلے پانچ بید کھانا تو
ر کوئی بات ہی نہیں، حسرت جان ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے ؎

ہم قول کے صادق ہیں، اگر جان بھی جاتی
واللہ کہ ہم خدمتِ انگریز نہ کرتے

نادر و نایاب کتابوں اور قلمی نسخوں کی ضبطی اور کوڑیوں کے مول، ان کا نیلام
ـــ سالہا سال کی قید و بند ـــ گیہوں پیسنے کی مشقت ـــ بید کھانے کی ذلت
ـــ عرصۂ دراز کی قیدِ تنہائی کی اذیت ـــ ناکافی گندے لباس کی بدبو اور غلاظت

---

[۱] "ان کی شہرت و عظمت کا دارومدار ان کی عشقیہ شاعری ہے" (آل احمد سرور)

— پاؤں میں لٹکتی ہوئی زنجیروں کی جھنکار — ناقص خوراک — غرض کوئی بھی شے تو اُن کے خروش اور ولولوں کو سرد نہیں کر سکتی حسرت کی سیرت کی پختگی اور شخصیت کی عظمت یہ ہے کہ اس پس منظر کے ساتھ، ان کی شاعری میں کسی طرح کی تلخی جھنجھلاہٹ اور مایوسی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ ایک طرح کا نشاط آمیز اور اُمید افزا لہجہ ان کے پورے کلام پر غالب ہے۔

حسرت موہانی کا قول ہے: "یقین کا عقیدہ، عام اس سے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی۔ ایک ایسی چیز ہے جس کو کسی خوف یا مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کر دینا اخلاقی گناہوں میں سے بدترین ہے جس کے ارتکاب کا کسی حریت پسند یا آزاد خیال اخبار نویس کو خیال بھی نہیں آ سکتا" — ان کی پوری زندگی اسی قول کی تفسیر نظر آتی ہے اور اسی قول کی صداقت پر استقامت نے ان کی شخصیت کو عظمت اور دلکشی بخشی ہے

حسرت نے بڑی پُرجوش اور ولولہ انگیز طبیعت پائی تھی۔ ان کی بے پناہ انرجی اور مختلف النوع صلاحیتیں ایک دُنیا کو منقلب کرنے کی آرزو مند نظر آتی ہیں۔ اسی انقلاب کی تکمیل کے لیے وہ مختلف سیاسی مسلک قبول و رد کرتے رہے۔ ان کی مضطرب اور بے چین شخصیت نے اپنی عمر طرح طرح کی آرزوؤں اور ارمانوں کی تکمیل میں بتا دی ان کے ہاں تضادات کی موجودگی اور سیاسی شعور کی کمی کی یہی توجیہہ ہے اور اُن کے تخلص کی نفسیات بھی — ع

میں رسوائے جہاں آرزو ہوں یعنی حسرت ہوں

اِس اعتبار سے اُن کے تضادات قابلِ اعتراض تو ہو سکتے ہیں مگر انہیں مطعون نہیں کیا جا سکتا۔

آج کی سیاسی اور معاشرتی صورتِ حال کے تناظر میں حسرت کی شخصی عظمت یا بنتی ہے کہ ان کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں وہ تمام اخلاقی اور انسانی خوبیاں موجود ہیں جو ہمیں آج کے سیاستدان میں نظر آتی ہیں اور نہ آج کے شاعر میں — آج کے

(نام نہاد) سیاست دان برسر اقتدار پارٹی میں محض شمولیت ہی کو وزارت کی تمہید سمجھتا ہے مگر حسرت نے آزادی کے لئے طویل اور جانکاہ جدّ و جہد کی بنیاد پر کوئی مفاد حاصل نہیں کیا۔ آج کا شاعر رُوپے پیسے کی ترازو لئے، اپنے ہر شعر کو تول بیچنے کے لئے تیار کھڑا ہے لیکن حسرت نے اپنے مجموعے "انتخاب حسرت" (مرتبہ: جلیل قدوائی) کی پندرہ فیصد رائلٹی کی دائمی آمدنی جامعہ بک ڈپو، دہلی کو بخش دی —— مجموعی طور پر دیکھیں تو حسرت کی شخصیت، اقبالؔ کے اس شعر کی تفسیر نظر آتی ہے ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

ان کی شخصیت کو دیکھیں تو احساس ہوتا ہے کہ زندگی سراپا جدّ و جہد ہے اور زندگی بسر کرنے کا لطف، اسی جد و جہد میں عملاً شریک ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ احساس ہمارے اندر انسانیت کے مستقبل پر بے پناہ یقین و اعتماد پیدا کرتا ہے۔

حسرت کی تمام تر خوبیوں کے باوجود، ہمیں ان کی عظمت میں غلو نہیں کرنا چاہئے[1] وہ فرشتے نہیں، انسان تھے۔ اپنی شخصیت کے تضادات کے باوجود یہ شخص منافقت، مکّاری، ریاکاری اور مادیت پرستی کے اس دور میں دمکتا ہوا ایک ہشت پہلو ہیرا معلوم ہوتا ہے جس میں کسی طرح کے تصنع یا بناوٹ کا گمان نہیں گزرتا —— حسرت کے تضادات سے باوجود ان کی عظمت مُسلّم ہے۔

---

[1] "ان میں وہ تمام باتیں پائی جاتی تھیں جو اقبالؔ کے قلندر میں پائی جاتی تھیں۔ وہ اقبالؔ کی اس اصطلاح کی زندہ مثال تھے"

(پروفیسر عبدالسلام ۔ "تخلیق و تنقید"، کراچی ۱۹۶۳ء)

امراؤ طارق

مولانا حسرت موہانی ایک نظر میں

نام ——— سید فضل الحسن
تخلص ——— حسرت
مولد ——— موہان ضلع اناؤ یو پی
والد ——— سید اظہر حسن ابن سید مہر الحسن ابن سید مظہر حسن
والدہ ——— شہر بانو بیگم بنت نیاز حسن
بھائی ——— سید روح الحسن - سید کریم الحسن - سید مبین الحسن
بہن ——— سلیمۃ النساء - منیبۃ النساء

سن ولادت و وفات | ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء ولادت (بحوالہ حالات حسرت موہانی از مولانا عارف ہسوی مطبوعہ ۱۳۳۷ھ) - ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء مطابق ۱۳۷۰ھ - انتقال لکھنؤ میں مدفون ہیں۔

ابتدائی تعلیم | موہان کوڑا جہاں آباد (فتح پور ہسوہ)

رسمی تعلیم | (۱) ۱۸۹۴ء - موہان سے اعزاز کے ساتھ مڈل پاس کیا اور پورے صوبے میں اول آئے۔

(۲) ۱۸۹۸ء - گورنمنٹ ہائی اسکول فتح پور ہسوہ سے انٹرنس کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔

(۳) - ۱۹۰۳ء - علی گڑھ کالج سے عربی اور ریاضی کے ساتھ بی۔ اے پاس کیا۔

قابلِ ذکر اساتذہ | ۱- موہان - میاں جی غلام علی

۲- فتح پور ہسوہ - مولانا سید ظہور الاسلام - مولانا نور محمد - مولانا حبیب الدین - محمد امیر خاں (نیاز فتحپوری کے والد)

شمارے شائع گئے ۔

۳۔ ۱۹۲۵ء میں کانپور سے ایک روزنامے کا اجرا کیا جس کا نام "مستقل" تھا۔ ایک سال بعد یہ روزنامہ دوروزہ، سہ روزہ اور ہفتہ وار ہوگیا ۱۹۳۳ء سے ماہانہ ہوگیا اور ۱۹۳۶ء سے اردوئے معلّٰی کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع ہونے لگا۔

سیاسی زندگی | طالب علمی کے زمانے ہی سے سیاست سے دلچسپی تھی۔ ۱۹۰۳ء سے سیاسی مضامین لکھنے شروع کئے۔ ۱۹۰۴ء سے عملی سیاست میں داخل ہوئے۔ کئی بار قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ پاک و ہند کی ساری سیاسی و سماجی تحریکوں میں سرگرم کارکن کی حیثیت سے شریک رہے۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر یوپی اسمبلی اور مرکزی دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔

کلام حسرت کی اشاعت | حسرت کا دیوان پہلی بار ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا اور کلیات کے عنوان سے ان کا کلام پہلی دفعہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔ حسرت کی زندگی میں ان کا کلیات آخری بار انتظامی پریس حیدرآباد سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں حسرت کے بارہ دیوان اور دو ضمیمے شامل ہیں۔ حسرت کا تیرھواں دیوان ۱۹۵۱ء میں حسرت کی وفات سے کچھ قبل لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ ۱۹۴۳ء تا ۱۹۵۱ء کے کلام پر مشتمل ہے۔ موجودہ کلیات جس میں تیرہ دواوین اور دو ضمیمے شامل ہیں۔ پہلے پہل ۱۹۷۵ء میں غلام علی اینڈ سنز لاہور نے شائع کیا بعد کو اس کے کئی اڈیشن شائع ہوئے۔

اُردو زبان کے قدیم گلدستے، جن کا تعارف اردوئے معلّٰی میں کرایا گیا

۱۔	گلدستہ شعرا ضمیمہ الزار الاخبار لکھنؤ	ستمبر ۱۹۱۱ء
۲۔	گلکدۂ ریاض خیر آباد	اکتوبر نومبر ۱۹۱۱ء
۳۔	نتیجۂ سخن کلکتہ	جنوری تا اپریل ۱۹۱۲ء
۴۔	پیام یار لکھنؤ	مئی تا اگست ۱۹۱۲ء
۵۔	فتنہ و عطر فتنہ گورکھپور	جنوری ۱۹۱۳ء

تالیفات و تصنیفات | (۱) کلیات حسرت موہانی طبع اول ۱۹۲۸ء

۳ - علی گڑھ - پروفیسر جے - سی چکرورتی - صاحبزادہ آفتاب احمد خاں - ڈاکٹر ضیاء اللہ مولانا خلیل احمد اسرائیلی -

حسرت کا مذہب و مشرب | حسرت مذہباً حنفی اور مشرباً قادری تھے - انھوں نے خود کہا ہے کہ میں قدامت پسند سنی اور صوفی ہوں - حسرت کا پورا خاندان شاہ عبدالرزاق فرنگی محلی کا ارادت مند تھا خود بھی بچپن ہی میں شاہ عبدالرزاق کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے تھے، ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند و جانشین مولانا عبدالوہاب سے بیعت کی تجدید کی -

زیارت حرمین | تیرہ حج کئے - پہلا ۱۹۳۲ء میں اور آخری ۱۹۵۰ء میں اور چودہ مرتبہ مدینہ منورہ میں حاضری دی - اپنی پہلی اور دوسری اہلیہ کو بھی کئی بار حج میں ساتھ لے گئے -

پہلی غزل | ۱۸۹۳ء میں کہی (کلیاتِ حسرت کے ضمیمہ میں شامل ہے)

شاعری میں تلمذ | سید فخر الحسن فطرت موہانی ؛ امیر اللہ تسلیم لکھنوی -

شادی | (۱) پہلی شادی ۱۹۰۱ء میں نشاط النساء بیگم بنت شبیر حسن موہانی سے ہوئی نشاط النساء بیگم کا ۱۹۳۷ء میں انتقال ہو گیا -

(۲) دوسری شادی ۱۹۳۸ء میں خاندان کی ایک بیوہ حبیبہ بیگم سے کی - وہ ابھی حیات ہیں اور کانپور میں ہیں -

اولاد | پہلی بیوی سے نعیمہ بیگم ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئیں جن کی ۱۹۲۲ء میں سید عبدالسمیع نصرت موہانی سے شادی ہوئی - کراچی میں سکونت پذیر ہیں -

دوسری بیوی سے خالدہ بیگم ۱۹۳۹ء میں پیدا ہوئیں - کانپور میں ہیں -

صحافتی زندگی | ۱ - جولائی ۱۹۰۳ء میں " اردوئے معلیٰ " کے نام سے ایک ماہنامہ علی گڑھ سے جاری کیا -

(۱) پہلا دور جولائی ۱۹۰۳ء تا جون ۱۹۱۳ء (مئی ۱۹۰۸ تا ستمبر ۱۹۰۹ حسرت کی گرفتاری کی وجہ سے پرچہ عارضی طور پر بند رہا)

(ب) دوسرا دور جنوری ۱۹۲۵ء تا مارچ ۱۹۴۲ء کانپور - (بقیہ صفحہ ۵۳ پر)

۲ - تذکرۃ الشعراء کے نام سے جولائی ۱۹۱۴ء میں سہ ماہی رسالہ جاری کیا - کل سات

ڈاکٹر امیر عارف

نیاز فتح پوری بحیثیت صحافی

(۱۹۲۲ء تا ۱۹۳۰ء)

اردو کی ادبی صحافت نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں وہ قوت اور وسعت حاصل کر لی تھی جس نے ہمارے ذہنوں کو نئی جلا دی اور ہمیں زندگی کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا۔ ادب کو نئے رجحانات اور تصورات سے آگاہ کیا۔ اس سفر کا آغاز سر سید کے "تہذیب الاخلاق" سے ہوتا ہے۔ اور بیسویں صدی کے آغاز میں ایک طرف الہلال، البلاغ اور ہمدرد جیسے اخبارات شمع آزادی کی لویں تیز کر رہے تھے۔ تو دوسری طرف۔ صلائے عام دہلی، مخزن لاہور، تمدن دہلی، نقاد آگرہ، زمانہ کانپور، ادیب الہ آباد، نیرنگ خیال لاہور، اردو اورنگ آباد، ادبی دنیا، ہمایوں لاہور اور نگار نے ہمارے ادب کی آبیاری کی۔

ان رسائل کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے مدیر صاحب طرز ادیب اور اپنے عہد کے مشہور اہل قلم تھے۔

"مخزن" کے ذریعہ جدید اردو شاعری کو فروغ حاصل ہوا جس کی ابتداء حالی کر چکے تھے۔ "نقاد" نے ادب لطیف کو اپنایا۔ ہمایوں، نیرنگ خیال، الناظر، تمدن ادبی دنیا وغیرہ نے اپنے رسائل میں تصاویر کی اشاعتوں کا خاص اہتمام کیا۔ خاص نمبروں اور سالناموں کی داغ بیل ڈالی۔ ان رسائل میں ملک کے مشہور اہل قلم ادیبوں اور شعراء کی نگارشات شائع ہوتی تھیں۔ ایک طرف ان کی ادبیت مسلم تھی تو دوسری طرف رسالہ کی جاذبیت بھی اپنی جگہ ایک اہم خصوصیت تھی۔ ان رسالوں کے لکھنے والوں میں اس دور کے اہم ترین اہل قلم شامل تھے۔ جن میں سر عبدالقادر، مولوی عبدالحق

برتھی، نوبت رائے نظر، پریم چند، چکبست، سرور جہان آبادی، نظم طباطبائی
لکھنوی، نادر کاکوروی، راشد الخیری، شیخ اکرم، ڈپٹی نذیر احمد، حسرت موہانی
ہنوی، شوق قدوائی، شاد عظیم آبادی اور سید احمد دہلوی قابل ذکر ہیں۔
س عہد میں مدیران رسائل خود صاحبِ قلم ہوتے تھے اس لئے ان رسائل کی
۔۔۔۔ اہمیت میں کسی کو شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی۔ ان رسائل کی
ئ بیسویں صدی کا آغاز ہی اردو صحافت کو اعتبار کا درجہ عطا کرتا ہے۔
ان رسائل کا ادبی معیار، بہت بلند تھا۔ افسانہ، نظم، غزل، مضامین
، ادب لطیف، عام معلوماتی مضامین، تبصرے وغیرہ بھرپور انداز میں ہوتے
۔ ان ہی کی بدولت اردو داں طبقہ نئی قدروں اور نئے معیاروں سے آشنا ہوا
اس تابناک عہد میں نیاز اور ان کے احباب (یاران نجد) نے نگار جاری
نگار کا پہلا شمارہ فروری ۱۹۲۲ء کو بھوپال سے شایع ہوا۔ اس طرح سے نیاز
راصل نگار کے ذریعہ اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور آخر دم تک اسی میدان
کام کرتے رہے۔ گو اس سے پہلے وہ روزنامہ زمیندار" لاہور کے نامہ نگار کی
بت سے کام کر چکے تھے۔ یہ زمانہ بڑا پر آشوب تھا۔ مسجد کانپور کا خونیں اور
اک حادثہ تمام مسلمانان ہند کی توجہ اپنی طرف مبذول کر چکا تھا۔ مولانا ظفر علی
، مدیر زمیندار کو ایک ایسے نامہ نگار کی ضرورت تھی جو مسجد کانپور کی عدالتی کارروائی
لم بند کر کے زمیندار کے لئے روانہ کر سکے۔ ان کی نگاہ انتخاب نیاز پر پڑی۔
اس وقت تک ادبی دنیا میں شہرت پا چکے تھے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں ۱۹۱۳ء
لہ الہلال، البلاغ اور زمیندار میں شایع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی تھیں۔
، کے مضامین" مشہد کانپور ۵ نومبر ۱۹۱۱ء کے الہلال اور کانپور سے متعلق دوسرے
ضامین بھی ۱۹۱۲ء سے الہلال میں شایع ہو رہے تھے۔
نیاز نے نامہ نگار کی حیثیت سے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور
ں فرض کو انھوں نے بحسن وخوبی انجام دیا۔ مسجد کانپور کی عدالتی کارروائی کو روز

بذریعہ تار زمیندار کے لئے روانہ کرتے تھے۔ اس طرح انھوں نے عدالتی کارروائی کی اٹھارہ قسطیں قلم بند کیں جو زمیندار" میں شایع ہوئیں اس رپورٹنگ میں انشا اور اسلوب کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ بلکہ اس میں عدالتی بیانات اور ملزمیں پہ وکلاء کی جرح اور دیگر تفصیلات شامل ہیں۔ نیاز کا تعلق چونکہ ابتدائی عمر میں محکمہ پولیس سے رہا تھا اس لئے وہ عدالتی اور دوسرے امور سے بخوبی واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عدالتی کارروائی کو ایک خاص ترتیب سے لکھا اور مقدمہ کی کارروائی سے عوام کو روشناس کرایا۔ اس طرح سے نیاز کی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۱۳ء سے بحیثیت نامہ نگار شروع ہو چکا تھا۔ اس کے بعد نیاز باقاعدہ ادارۂ "زمیندار" سے منسلک ہوئے۔ ظفر علی خاں نے نیاز کی ادارہ میں شمولیت پر ایک نوٹ شایع کیا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی نیاز کے قدردان تھے اور زمیندار کے قارئین بھی۔ نیاز کی بحیثیت ادیب و شاعر اور صحافی قدر کرتے تھے۔ اپنے نوٹ میں ظفر علی خاں لکھتے ہیں۔

> مولوی نیاز محمد خاں صاحب، نیاز فتح پوری کے نام سے ہمارے نکتہ سنج ناظرین نا آشنا نہ ہوں گے۔ مولوی صاحب کے مضامین نظم و نثر کئی باران اوراق کا سرمایۂ نازش ثابت ہو چکے ہیں اب آپ مستقل طور سے زمیندار کی سلک صحافت سے منسلک ہو چکے ہیں اور ہم اس تعلق کو زمیندار کی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔ ؎۵

لیکن یہ سلسلہ چھ ماہ تک قایم رہا کیونکہ نیاز اور ظفر علی خاں کے مزاج میں ہم آہنگی نہ تھی اس لئے نیاز کو زمیندار سے قطع تعلق کرنا پڑا۔

زمیندار سے علیحدگی کے بعد نیاز نے بحیثیت معاون ایڈیٹر کے "توحید" میرٹھ کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ توحید ہفتہ وار علمی ادبی اور سیاسی رسالہ تھا۔ اسکی حیثیت

؎۵۔ اداراتی نوٹ۔ زمیندار لاہور ص ۱۔ ۹ ستمبر ۱۹۱۳ء جلد ۴، نمبر ۲۰۴

یہی تھی جو الہلال، زمیندار اور ہمدرد کی تھی اس کے پہلے ایڈیٹر خواجہ حسن نظامی تھے۔ اُن کی اور نیاز کی تحریروں نے بہت جلد توحید کے معیار کو بلندی پر پہنچا دیا۔

۱۹۱۴ء میں ملا رموزی کے اخبار ہفتہ وار "خطیب" میں نیاز کے علمی، ادبی اور مذہبی مضامین شائع ہوتے رہے اس وقت اُن کے مذہبی مضامین بھی ادبی مضامین کی طرح پسند کئے جاتے تھے۔

۱۹۱۹ء میں سردار دیوان سنگھ مفتوں کا اخبار "رعیت" ملا رموزی اور احسان الحق نے لے لیا۔ ملا رموزی نے نیاز صاحب سے درخواست کی کہ وہ بھوپال سے چھٹی لے کر آجائیں اور "رعیت" کی چیف ایڈیٹری سنبھال لیں۔ لیکن یہ اخبار تین مہینہ سے زیادہ نہ چل سکا۔ رعیت کی پالیسی معتدل تھی اور عارف ہسوی انگریزوں کی مخالفت میں انتہا پسند تھے۔ اس لئے ان کی انتہا پسندی کے آگے نیاز اور ملا رموزی کی معتدل پالیسی نہ چل سکی اور آخر کار اسے مالی دشواری کی بنا پر بند کرنا پڑا۔ نیاز "رعیت" کے چیف ایڈیٹر تین ماہ تک رہے۔

نیاز کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ انھوں نے جس رسالے یا ہفتہ وار اخبار کو مرتب کیا اس پر اپنی گہری چھاپ چھوڑ دی۔

فروری ۱۹۲۲ء میں نیاز اور "یاران نجد" نے مل کر نگار جاری کیا اور اس کی ادارت کے فرائض نیاز کے سپرد ہوئے۔ جب سے وہ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۶۶ء تک مسلسل ۴۴ سال تک بڑی آب و تاب سے نکالتے رہے۔ نگار کے اجرا کے متعلق نیاز صاحب لکھتے ہیں:۔

> غالباً نومبر ۱۹۲۱ء کی بات ہے کہ لطیف الدین احمد (ل۔ احمد) کے مکان پر چند مخصوص احباب۔ ضیائے عباس ہاشمی، محمود اکبرآبادی، ملک حبیب احمد خاں، مقدس اکبرآبادی، شاہ دلگیر وغیرہ اور خود لطیف صاحب کا اجتماع ہے۔ ایک رسالہ جاری کرنے کی تجویز پر گفتگو ہوتی ہے۔ (اس وقت نقاد بند ہو چکا تھا) اور اس کا اجرا طے پاتا ہے

اس کے بعد دو سوال سامنے آتے ہیں۔ ایک نام کا اور دوسرا سرمایہ کا۔ چونکہ یہ بات پہلے طے ہو چکی تھی کہ میں اسے مرتب کرونگا اسلیئے ایڈیٹر کی زندگی کا کوئی سوال سامنے نہیں تھا۔ رہا نام تو اسکے متعلق جب میری رائے طلب کی گئی تو میں نے نگار تجویز کیا کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ترکی زبان سیکھنے کا بھی مجھ پر جنون سوار تھا۔ نگار بنت عثمان ترکی کی مشہور شاعرہ میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی ۔
اس کے بعد جب سرمایہ کا سوال سامنے آیا تو یہ طے پایا کہ فی الحال کم از کم بیس احباب بیس بیس روپیئے نگار فنڈ میں جمع کر دیں اور پہلا پرچہ آگرہ سے شایع ہو۔ اس کے بعد میں بھوپال واپس آ گیا اور پہلا پرچہ (۲۲ فروری) مرتب کر کے آگرہ بھیجدیا گیا۔ محمود اور لطیف نے اسے آگرہ پریس میں چھپوا کر شایع کیا۔ لیکن مجھے نہیں معلوم کہ اول اول کن حضرات نے موعودہ عطیہ ادا کیا۔ لیکن اسقدر ضرور جانتا ہوں کہ امید سے بہت کم سرمایہ فراہم ہوا۔ تاہم نگار اپنی پہلی اشاعت کے بعد خود کفیل ہو گیا تھا۔ اس لئے سرمایہ کی فراہمی کا سوال زیادہ اہم نہ رہا اور دسمبر ۱۹۲۲ء تک نگار آگرہ سے نکلتا رہا۔

چونکہ یہ بات زحمت طلب تھی کہ رسالہ کی ترتیب بھوپال میں ہو اور اشاعت آگرہ میں۔ اس لئے ۲۲ فروری سے نگار کی اشاعت بھی بھوپال سے شروع ہو گئی۔ [۵۱]

اس طرح سے نگار کی ابتدا ہوئی اور یہی ابتدا آگے چل کر ایک تحریک صورت اختیار کر گئی اور نیاز و نگار ادارے کی صورت اختیار کر گئے۔ نگار کی پہلی اشاعت میں نیاز نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ نگار کو کیا بنانا چاہتے ہیں لکھتے

۵۱۔ والد مرحوم میں اور نگار۔ نیاز ص ۳۹، ۴۰ نیاز نمبر حصہ اول ۱۹۶۳ء

جس وقت ترتیب نگار کے فرائض پر میں نے غور کیا تو ضروریات
زمانہ کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ تو میں نے پہلی ہی سانس میں کرلیا کہ
نگار کو خالص ادبی رسالہ تو بننے نہ دونگا کیونکہ ادب کی وہ مانگ
جو چند سال پیشتر تھی باقی نہیں رہی۔ ؎۱

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نیاز کو اپنے عہد کے مزاج اور تبدیلیوں کا شدید احساس تھا اور وہ رسالے کو انگریزی لفظ میگزین کے مترادف سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے خالص ادب سے گریز کیا اور تاریخ، سیاست، ادب، معلومات عامہ (تاریخی و علمی) اور فنون لطیفہ سے رسالے کو مزین کیا۔ اداریہ سے نیاز کی بلند نظری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ نیاز نے نگار کے اغراض و مقاصد کبھی شائع نہ کئے لیکن انھوں نے رسالے کو روشن خیالی، جدید تصورات اور عقلیت پسندی کا ترجمان بنایا۔ انھیں اپنے آپ پر پورا پورا بھروسہ تھا اور انھیں پڑھنے والوں کے مذاق پر بھی اعتماد تھا کیونکہ انھیں توحید، خطیب، رعیت وغیرہ کے زمانے میں ادارت کے فرائض کی بدولت معیاری صحافت کا بخوبی اندازہ ہوگیا تھا۔ انھیں اپنے زمانے کی بدلتی ہوئی ادبی، سماجی قدروں کا بھی بخوبی احساس تھا۔ اس لئے وہ پہلے شمارے میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ حقیقت غالباً کسی سے مخفی نہیں کہ امتداد زمانہ کے ساتھ جس طرح
انسان کی تہذیب، معاشرت تغیر پذیر ہو جاتی ہے اسی طرح اس کے
داعیات قلب و دماغ میں بھی انقلاب پیدا ہونا ضروری ہے۔ وہی شخص
جو کل تک صرف قصص و حکایات سے آسودہ ہو جاتا تھا۔ آج زیادہ
کارآمد لٹریچر کا خواہشمند ہوسکتا ہے۔ ؎۲

؎۱ عناصر نگار نیاز ص ۵ فروری ۲۲ء

؎۲ عناصر نگار نیاز ص ۵ فروری ۲۲ء

اسی ذہنیت نے نیاز کو روائتی مدیر بننے سے روکا۔ نگار کے اجراء سے نیاز کی ادبی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

نگار کی ابتدا ہی سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ صوری طور پر زیادہ دلکش اور جاذب نظر نہیں رہا اور نہ نیاز نے کبھی اس کو ظاہری طور سے جاذب نظر بنانے کی کوشش کی۔ ابتداء سے جو روش نیاز نے نگار کے سلسلے میں اختیار کی تھی وہ آخر تک قائم رہی۔ ابتدائی دور میں نیاز مدیر کے بجائے رئیس التحریر جیسے بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ رئیس التحریر کی جگہ ایڈیٹر نے لی مدیر لکھنا اس لئے پسند نہیں تھا کہ وہ عام روش سے ہٹ کر چلنے کے عادی تھے اور اس وقت تمام رسالوں کے سرورق پر مدیر ہی لکھا جاتا تھا۔ نگار نے ابتدائی دور سے ملک کے مشہور اہل قلم کا ایک حلقہ پیدا کر لیا تھا جن میں مختلف اسالیب اور مکاتب فکر کے لکھنے والے شامل تھے۔ اگر ہم نگار ۱۹۲۲ء کے قلمی معاونین پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس کے اہم قلمی معاونین میں ل۔ احمد، ضیائی، مخمور اکبرآبادی، مانی جائسی، جوش، امتیاز علی تاج، فانی بدایونی، حامد حسن قادری، آغا حیدر، حسن دہلوی، عزیز لکھنوی حکیم احمد شجاع، وحشت کلکتوی، خلیق دہلوی، راز چاند پوری، امین حزیں، شاد عظیم آبادی، وغیرہ نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد اس فہرست میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ شاہ دلگیر، مجنوں گورکھپوری، پروفیسر نعیم الرحمٰن، سیماب وحسرت کے نام نامی بھی ہمیں بعد میں نظر آتے ہیں۔ ایک سال کے اندر ہی اس قدر مشہور اہل قلم یکجا ہونا نیاز کی بدولت ہی ممکن ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ نگار کی مقبولیت اور اہمیت دن بدن بڑھتی گئی۔ اپنے عہد کے خوبصورت اور دلکش باتصویر رسالوں کے درمیان سادہ سرورق اور معمولی کاغذ کے باوجود بہت جلد نگار نے اہمیت حاصل کر لی۔

نیاز نے ۱۹۲۲ء سے بعض خاص خاص کالم شروع کئے عناصر نگار کے کے بجائے ملاحظات (اداریہ) استفسارات وجواب اور معلومات عامہ وغیرہ

بداء میں ملاحظات کو انھوں نے "احوال نگار" تک محدود رکھا تھا۔ استفسار جواب کو تاریخی اور علمی معاملات کے لئے مخصوص کردیا تھا۔ معلومات کے عنوان سے وہ مختلف سائینسی اور علمی مسائل پر روشنی ڈالتے تھے۔ اس حصہ میں فلسفہ کے موضوع پر مختصر نوٹ شایع کئے جاتے تھے۔

ادبی حصہ بہت زیادہ وقیع ہوا کرتا تھا۔ جس میں ادب، شعر، تنقید، افسانہ، ڈرامہ، غیر ملکی ادب کے ترجمے، اردو، ہندی شاعری کی تاریخ پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ تاریخ عالم، سیاست، تاریخ وجغرافیہ پر مختلف معلوماتی مضامین شایع ہوتے تھے۔ تنقید وتبصرہ ہر ماہ ہوا کرتا تھا۔

دسمبر ۱۹۲۲ء میں نیاز نے ملاحظات کو "احوال نگار" کی قیود سے آزاد کیا اور اپنے دائرۂ تحریر کو بھی وسیع کیا۔ اب انھوں نے اہم سیاسی، سماجی اور ثقافتی مسائل پر لکھنا شروع کیا۔

ملاحظات کے عنوان سے نگار نے پہلا سیاسی اداریہ ستمبر ۱۹۲۸ء میں لکھا۔ جو "بردولی" بمبئی میں لگان کے متعلق ہے۔ اور دوسرا نہرو رپورٹ پر ہے۔ "بردولی" میں انگریزی حکومت نے غریب کسانوں پر لگان میں اضافہ کردیا تھا۔ نیاز نے اس ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی دوسری طرف انھوں نے نہرو رپورٹ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ لکھتے ہیں۔

> نہرو کمیٹی نے جو رپورٹ "مستقبل ہند" کے نام سے مرتب کی ہے خواہ اس میں کتنے ہی نقائص کیوں نہوں لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ تمام اقوام ہند کو کسی ایک مرکز پر لانے کے لئے اس سے بہتر کوئی تدبیر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ [۵۱]

نیاز اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ ہندوستانی سیاست میں سیاست اور

۵۱۔ ملاحظات نیاز۔ ص ۵۶۔ نگار ستمبر ۱۹۲۸ عیسوی

اس کے بعد دو سوال سامنے آتے ہیں۔ ایک نام کا اور دوسرا سرمایہ کا۔ چونکہ یہ بات پہلے طے ہو چکی تھی کہ میں اسے مرتب کرونگا اسلیئے ایڈیٹر کی زندگی کا کوئی سوال سامنے نہیں تھا۔ رہا نام تو اسکے متعلق جب میری رائے طلب کی گئی تو میں نے نگار تجویز کیا کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ترکی زبان سیکھنے کا بھی مجھ پر جنون سوار تھا۔ نگار بنت عثمان ترکی کی مشہور شاعرہ میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔
اس کے بعد جب سرمایہ کا سوال سامنے آیا تو یہ طے پایا کہ فی الحال کم از کم بیس احباب بیس بیس روپیئے نگار فنڈ میں جمع کر دیں اور پہلا پرچہ آگرہ سے شائع ہو۔ اس کے بعد میں بھوپال واپس آگیا اور پہلا پرچہ (۲۲ر فروری) مرتب کر کے آگرہ بھیجدیا گیا۔ محمود اور لطیف نے اسے آگرہ پریس میں چھپوا کر شائع کیا۔ لیکن مجھے نہیں معلوم کہ اول اول کن حضرات نے موعودہ عطیہ ادا کیا۔ لیکن اسقدر ضرور جانتا ہوں کہ امید سے بہت کم سرمایہ فراہم ہوا۔ تاہم نگار اپنی پہلی اشاعت کے بعد خود کفیل ہو گیا تھا۔ اس لئے سرمایہ کی فراہمی کا سوال زیادہ اہم نہ رہا اور دسمبر ۱۹۲۲ء تک نگار آگرہ سے نکلتا رہا۔
چونکہ یہ بات زحمت طلب تھی کہ رسالہ کی ترتیب بھوپال میں ہو اور اشاعت آگرہ میں۔ اس لئے ۲۲ر فروری سے نگار کی اشاعت بھی بھوپال سے شروع ہو گئی۔ ۵۱

اس طرح سے نگار کی ابتدا ہوئی اور یہی ابتدا آگے چل کر ایک تحریک صورت اختیار کر گئی اور نیاز و نگار ادارے کی صورت اختیار کر گئے۔ نگار کی اشاعت میں نیاز نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ نگار کو کیا بنانا چاہتے ہیں لکھ

۵۱۔ والد مرحوم میں اور نگار۔ نیاز ص ۳۹، ۴۰۔ نیاز نمبر حصہ اول ۶۳

جس وقت ترتیب نگار کے فرائض پر میں نے غور کیا تو ضروریات زمانہ کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ تو میں نے پہلی ہی سانس میں کر لیا کہ نگار کو خالص ادبی رسالہ تو بننے نہ دونگا کیونکہ ادب کی وہ مانگ جو چند سال پیشتر تھی باقی نہیں رہی۔ ۵۱

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نیاز کو اپنے عہد کے مزاج اور تبدیلیوں کا شدید احساس تھا اور وہ رسالے کو انگریزی لفظ میگزین کے مترادف سمجھتے تھے اس لئے انھوں نے خالص ادب سے گریز کیا اور تاریخ، سیاست، ادب، معلومات عامہ (تاریخی و علمی) اور فنون لطیفہ سے رسالے کو مزین کیا۔ اداریہ سے نیاز کی بلند نظری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ نیاز نے نگار کے اغراض و مقاصد کبھی شایع نہ کئے لیکن انھوں نے رسالے کو روشن خیالی، جدید تصورات اور عقلیت پسندی کا ترجمان بنایا۔ انھیں اپنے آپ پر پورا پورا بھروسہ تھا اور انھیں پڑھنے والوں کے مذاق پر بھی اعتماد تھا کیونکہ انھیں توحید، خطیب، رعیت وغیرہ کے زمانے میں ادارتی فرائض کی بدولت معیاری صحافت کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ انھیں اپنے زمانے کی بدلتی ہوئی ادبی، سماجی قدروں کا بھی بخوبی احساس تھا۔ اس لئے وہ پہلے شمارے میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ حقیقت غالباً کسی سے مخفی نہیں کہ امتداد زمانہ کے ساتھ جس طرح انسان کی تہذیب، معاشرت تغیر پذیر ہو جاتی ہے اسی طرح اس کے داعیات قلب و دماغ میں بھی انقلاب پیدا ہونا ضروری ہے۔ وہی شخص جو کل تک صرف قصص و حکایات سے آسودہ ہو جاتا تھا۔ آج زیادہ کارآمد لٹریچر کا خواہشمند ہو سکتا ہے۔ ۵۲

---

۵۱ عناصر نگار نیاز ص ۵ فروری ۲۲ء

۵۲ عناصر نگار نیاز ص ۵ فروری ۲۲ء

اسی ذہنیت نے نیاز کو روایتی مدیر بننے سے روکا۔ نگار کے اجراء سے نیاز کی ادبی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

نگار کی ابتدا ہی سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ صوری طور پر زیادہ دلکش اور جاذب نظر نہیں رہا اور نہ نیاز نے کبھی اس کو ظاہری طور سے جاذب نظر بنانے کی کوشش کی۔ ابتدائی سے جو روش نیاز نے نگار کے سلسلے میں اختیار کی تھی وہ آخر تک قائم رہی۔ ابتدائی دور میں نیاز مدیر کے بجائے رئیس التحریر جیسے بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ رئیس التحریر کی جگہ ایڈیٹر نے لی مدیر لکھنا اس لئے پسند نہیں تھا کہ وہ عام روش سے ہٹ کر چلنے کے عادی تھے اور اس وقت تمام رسالوں کے سرورق پر مدیر ہی لکھا جاتا تھا۔ نگار نے ابتدائی دور سے ملک کے مشہور اہل قلم کا ایک حلقہ پیدا کر لیا تھا۔ جن میں مختلف اسالیب اور مکاتب فکر کے لکھنے والے شامل تھے۔ اگر ہم نگار ۱۹۲۲ء کے قلمی معاونین پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس کے اہم قلمی معاونین میں ل۔احمد، ضیائی، محمود اکبرآبادی، مانی جائسی، جوش، امتیاز علی تاج، فانی بدایونی، حامد حسن قادری، آغا حیدر، حسن دہلوی، عزیز لکھنوی حکیم احمد شجاع، وحشت کلکتوی، خلیق دہلوی، راز چاند پوری، امین حزیں، شاد عظیم آبادی، وغیرہ نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد اس فہرست میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ شاہ دلگیر، مجنوں گورکھپوری، پروفیسر نعیم الرحمٰن، سیماب و حسرت کے نام نامی بھی ہمیں بعد میں نظر آتے ہیں۔ ایک سال کے اندر ہی اس قدر مشہور اہل قلم یکجا ہونا نیاز کی بدولت ہی ممکن ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ نگار کی مقبولیت اور اہمیت دن بدن بڑھتی گئی۔ اپنے عہد کے خوبصورت اور دلکش باتصویر رسالوں کے درمیان سادہ سرورق اور معمولی کاغذ کے باوجود بہت جلد نگار نے اہمیت حاصل کر لی۔

نیاز نے ۱۹۲۲ء سے بعض خاص خاص کالم شروع کئے عناصر نگار کے کے بجائے ملاحظات (اداریہ) استفسارات وجواب اور معلومات عامہ وغیرہ

ادمیں ملاحظات کو انھوں نے "احوال نگار" تک محدود رکھا تھا۔ استفسار
اب کو تاریخی اور علمی معاملات کے لئے مخصوص کردیا تھا۔ معلومات کے عنوان
، وہ مختلف سائنسی اور علمی مسائل پر روشنی ڈالتے تھے۔ اس حصہ میں فلسفہ
موضوع پر مختصر نوٹ شائع کئے جاتے تھے۔
ادبی حصہ بہت زیادہ وسیع ہوا کرتا تھا جس میں ادب، شعر،
ید، افسانہ، ڈرامہ، غیر ملکی ادب کے ترجمے، اردو، ہندی شاعری کی تاریخ پر
شنی ڈالی جاتی تھی۔ تاریخ عالم، سیاست، تاریخ وجغرافیہ پر مختلف معلوماتی
سامین شائع ہوتے تھے۔ تنقید وتبصرہ ہر ماہ ہوا کرتا تھا۔
دسمبر ۱۹۲۲ء میں نیاز نے ملاحظات کو "احوال نگار" کی قیود سے آزاد
یا اور اپنے دائرۂ تحریر کو بھی وسیع کیا۔ اب انھوں نے اہم سیاسی، سماجی اور ثقافتی
سائل پر لکھنا شروع کیا۔
ملاحظات کے عنوان سے نگار نے پہلا سیاسی اداریہ ستمبر ۱۹۲۸ء میں
ھا۔ جو "بردولی" بمبئی میں لگان کے متعلق ہے۔ اور دوسرا نہرو رپورٹ پر ہے۔
ردولی" میں انگریزی حکومت نے غریب کسانوں پر لگان میں اضافہ کردیا تھا۔
از نے اس ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی دوسری طرف انھوں نے نہرو
پورٹ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ لکھتے ہیں۔

> نہرو کمیٹی نے جو رپورٹ "مستقبل ہند" کے نام سے مرتب
> کی ہے خواہ اس میں کتنے ہی نقائص کیوں نہوں لیکن اس سے انکار
> نہیں ہوسکتا کہ تمام اقوام ہند کو کسی ایک مرکز پر لانے کے لئے اس سے
> بہتر کوئی تدبیر ہوہی نہیں سکتی تھی۔ ۵۱

نیاز اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ ہندوستانی سیاست میں سیاست اور

۵۱۔ ملاحظات نیاز۔ ص ۵۶۔ نگار ستمبر ۱۹۲۸ عیسوی

مذہب کو خلط ملط کر دیا ہے۔ جو ایک خطرے کی علامت ہے۔ اس لئے انھوں
نے مسلسل تین ماہ۔ ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۲۸ء کے ملاحظات میں "نہرو رپورٹ"
کو سراہا اور مسلمانوں کی تنگ نظری اور قدامت پسندی اور شک وشبہ کی ذہنیت
پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ وہ خلافت کمیٹی کی سیاست سے مایوس ہو چکے
تھے اس لئے انھوں نے ان تمام مسلم انجمنوں کو تحلیل کر دینے کا مشورہ دیا جو ان کے
خیال میں اتحاد کو پارہ پارہ کر رہی تھیں۔ نہرو رپورٹ اور "سائمن کمیشن" پر تنقید
روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> جس وقت تک ایک ملک کی مذہبی جماعتیں مذہب سے علیحدہ ہو کر یعنی مذہب کو بالکل ذاتی اور انفرادی چیز سمجھ کر سیاست میں حصّہ نہ لیں اسوقت تک کبھی اتحاد عمل نہیں ہو سکتا ہے اور یہ یقیناً بہت مشکل ہے۔ نہ مسلمانوں میں ایسے وسیع الخیال موجود ہیں اور نہ ہندوؤں میں اور میرے نزدیک تاریخ مذہب کی تمام خونیں داستانوں میں اس سے زیادہ دردناک داستان اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ ۵۱

نیاز نے ہمیشہ ملک کو درپیش مسائل کی طرف صحتمندانہ اور ترقی
پسندانہ رویہ اپنایا۔ یہی وجہ ہے کہ "نہرو رپورٹ" کی مخالفت مسلمانوں کے ایک
طبقہ نے کی تو نیاز نے برقت تنبیہہ کی اور اس مخالفت کے خطرات سے
آگاہ کیا۔

"نہرو رپورٹ" میں ہندوستان کے لئے "ڈومنین ہوم رول"
کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس رپورٹ سے انھیں پورا اتفاق تھا۔ لیکن پھر بھی
رپورٹ کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:-

۵۱۔ ملاحظات نیاز۔ ص ۵۶۔ نگار ستمبر ۱۹۲۸ء

"نہرو رپورٹ" میں جس نوع کی حکومت ہندوستان کے لئے طلب کی گئی ہے وہ یقیناً کسی خوددار قوم کیلئے باعث فخر و ناز نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے کسی قوم کی عالی حوصلگی کا پتہ چلتا ہے لیکن ادھر برطانیہ کی پیچیدہ پالیسی اور عجیب طرز حکومت کو دیکھتے ہوئے اور ادھر خود سرزمین ہند میں بسنے والے دیوانہ مذہب قوموں کے اختلاف آراء پر نگاہ ڈالتے ہوئے جو کچھ طلب کیا گیا ہے وہ بڑی حد تک سب کو ایک مرکز پر لانے کا امکان اپنے اندر رکھتا ہے [۵۱]

مارچ ۱۹۲۹ء میں انگریزی حکومت نے ہندوستان کے تمام اشتراکی لیڈروں کو گرفتار کر کے ان پر ایک سازشی مقدمہ چلایا جو میرٹھ سازشی کیس کے نام سے مشہور ہے۔ ان گرفتاریوں کے بعد نیاز نے انتہائی دلیری اور بے باکی کے ساتھ کمونزم اور سوشلزم کی تعریف اور اس کے ارتقاء سے بحث کی۔ یہ ملاحظات اس لئے اہم ہیں کہ وہ اشتراکیت کو مظلوموں، کاشتکاروں، مزدوروں اور محنت کشوں کا انقلابی فلسفہ مانتے ہیں۔ نیاز کو اس بات کا بھی علم تھا کہ آج دنیا کا بڑا حصہ اشتراکی نظام کے زیر سایہ آچکا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

میں اصول اشتراکیت کا حامی نہیں ہوں اور نہ اسے افلاس کا مداوا سمجھتا ہوں۔ کیونکہ وہ میرے نزدیک اصول فطرت کے منافی ہے لیکن میں ہر اس تحریک کا طرفدار ہوں جو مزدوروں اور کاشتکاروں کی اصلاح و ترقی سے متعلق ہے۔ [۵۲]

اس سے نیاز کی روشن خیالی اور ملک کی اہم تحریکوں سے ان کی دلچسپی کا بھی ثبوت ملتا ہے اور ان کی ذہنی لچک کا بھی۔

۵۱۔ ملاحظات نیاز ص ۳ نگار مارچ ۱۹۲۹ء

۵۲۔ " " ص ۵ نگار اپریل ۱۹۲۹ء

پنجاب کے "راجپال" نامی ایک آریہ سماجی لیڈر نے "رنگیلا رسول" نامی کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب کی بدولت مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ ہوا بھی یہی کہ ایک مسلمان نے راجپال کو مذہبی جوش عقیدت میں قتل کر دیا سارے ملک میں فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہو گئی۔ ایسے کشیدہ ماحول میں بھی نیاز کا قلم اعتدال اور توازن کی راہ سے نہیں ہٹا۔ کیونکہ ہمیشہ ان کی نظر ظاہری واقعات سے زیادہ محرکات پر رہتی تھی۔ رنگیلا رسول کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :۔

> ہر چند راجپال نے "رنگیلا رسول" لکھ کر یہ بات ثابت کر دی کہ وہ کوئی ایسا دماغ لے کر نہیں آئے جس کے فقدان پر کسی قوم کو ماتم کرنے کی ضرورت ہو بلکہ وہ دماغ بھی وہی ذہنیت رکھتا تھا جو ان کے قاتل کی تھی۔ لیکن ہم اس کی شکایت ہندوؤں سے نہیں کر سکتے کیونکہ مسلمانوں میں بھی متعدد راجپال پائے جاتے ہیں۔

نیاز ملاحظات میں صرف ملکی ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی حالات پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں وہ ملکی مسائل کو بین الاقوامی مسائل کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور محرکات کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

نیاز کا امان اللہ خاں اور افغانستان سے ہمدردی رکھنا بالکل فطری اور لازمی امر تھا کیونکہ امان اللہ خاں کو جاہل پٹھان اور غیر ملکی ایجنٹ اور ملاؤں سے واسطہ پڑا تھا جو اس کی حکومت کو ختم کرنے کے در پے تھے اور نیاز کی ہمدردیاں غازی امان اللہ خاں کے ساتھ تھیں۔ لکھتے ہیں۔

> دیکھنا ہے کہ افغانستان کے کور باطن ملاؤں کا اثر کامیاب ہوتا ہے یا ایک روشن دماغ مصلح فرمانروا کا۔ اگر اس جنگ میں امان اللہ خاں کو کامیابی نہ ہوئی تو یہ تاریخ کا کوئی نیا واقعہ نہ ہوگا۔ کیونکہ بارہا تاریکی کو نور پر چھاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ لیکن یہ یقین ہے کہ افغانستان کی یہ ملا گردی باقی نہیں رہے گی۔ اگر امان اللہ خاں

نہیں تو خدا کا کوئی اور بندہ جلد یا بدیر ان خبیثوں سے ملک کو پاک کر دے گا۔ [۵۱]

افغانستان سے جب امان اللہ خاں کو جلا وطن کیا گیا تو نیاز نے ملاحظات کو سیاہ حاشیہ کے ساتھ شائع کیا اور امان اللہ خاں کے ماتم تک ملاحظات کو محدود رکھا۔ اس طرح کا ماتم اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ہر ملک میں ترقی پسند رجحانات کی شکست پر کس طرح ملول ہوتے تھے۔

ملکی سیاست اور مذہبی تنگ نظری سے ہٹ کر نیاز صاحب جب ملاحظات میں لکھنؤ کی سرزمین کا ذکر چھیڑتے ہیں تو ان کا اشہب قلم طرارے بھرنے لگتا ہے اور جیتا جاگتا لکھنؤ انکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

نیاز نے کبھی اہم مسائل سے غفلت نہیں برتی بلکہ انھوں نے ملک کی جدوجہد میں اپنے کو بھی اسی جوش و خروش سے شامل کیا۔ جس طرح ان کے بہت سے ہم قوم کر رہے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں لاہور کانگریس کا وہ اہم سیشن منعقد ہوا جس میں آزادی کامل کا رزولیشن پاس ہوا اور اسی کے ساتھ کونسلوں اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ سے کانگریس کے نمائندوں کو باہر نکل آنے کا حکم دیا گیا۔ چونکہ انگریزی حکومت ڈومینین اسٹیٹ پر بھی بات چیت کے لئے تیار نہیں تھی اور کانگریس گول میز کانفرنس میں ڈومینین اسٹیٹ کے علاوہ اور کسی سمجھوتہ پر آمادہ نہ تھی۔ اس کے نتیجہ میں کانگریس نے بائیکاٹ کر دیا تھا لاہور کانگریس کی کارروائی پر نیاز کا اداریہ معقول اور متوازن رویہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ لاہور کانگریس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

میرے نزدیک مناسب یہ تھا کہ فی الحال مکمل آزادی کی تجویز گول میز کانفرنس کے انعقاد تک ملتوی کر دیا جائے اور وہیں یہ

---

[۵۱] ملاحظات نیاز ص ۶۰۶ نگار مئی ۱۹۲۹ء

مطالبہ پیش کیا جاتا کہ اس کانفرنس میں ڈومینین اسٹیٹس پر بحث کی جائے اور برطانوی حکومت اس کانفرنس کی تجویز پر بحث کرے اگر یہ دونوں شرطیں منظور ہو جائیں تو خیر ورنہ کانفرنس کو چھوڑ کر چلے آتے اور عمل ایسا ہوتا کہ شاید اس کے بعد ہندوستان کے کسی فریق کو اختلاف نہ ہوتا . . . . . دوسرا حصہ تجویز کا جو کونسلوں وغیرہ کے بائیکاٹ کے متعلق ہے وہ بھی میری رائے میں نامناسب ہے کیونکہ اگر اس باب میں سارا ملک ہم آہنگ ہوتا تو کوئی نتیجہ پیدا ہو سکتا تھا۔ [۵۱]

جدوجہد آزادی کے دوران کانگریس قوم پرستوں کی نمائندہ اور مسلم لیگ مسلمانوں کی جماعت تھی لیکن ملک کے ان دو بڑے طبقوں کے سوچنے سمجھنے کے انداز جدا جدا تھے اور دونوں ایک دوسرے سے شاکی تھے۔ خود کانگریسی خیال کے مسلمانوں میں یہ جذبہ پرورش پا رہا تھا کہ مسلمانوں کی شکایات پر کانگریس توجہ نہیں دیتی یا پھر وہ اس مسئلہ کو اہم نہیں سمجھتی اس سلسلہ میں نیاز نے جو رویہ اپنایا اور جس طرح بروقت تنبیہ کی اس سے ان کی سیاسی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

آج ہندو جماعت مسلمانوں کی عصبیت اور تنگ نظری کی شاکی نظر آتی ہے لیکن کیا واقعات اور عمل زندگی کے تجربات جس کا مشاہدہ روز ہوتا رہتا ہے اس حقیقت کو محو کر دیں گے کہ جو جماعت ہم سے فراخدلی اور رواداری چاہتی ہے وہ خود ہمارے لئے کس درجہ مکلف تنگ نظر اور متعصب ثابت ہو رہی ہے میں نہیں کہتا کہ اس جماعت کے قائد و رہنما بھی اس مرض میں مبتلا ہیں لیکن یہ الزام ان سے کبھی دفع نہیں ہو سکتا کہ باوجود اس علم کے انھوں نے کبھی اپنے ملک کو صحیح معنی میں اس نقص کے رفع کرنے پر کبھی آمادہ نہیں کیا۔

---

[۵۱]۔ ملاحظات نیاز ص ۵۰۴ نگار۔ فروری ۱۹۳۰ء

ملک کی آزادی نہ گول میز کانفرنس سے مل سکتی ہے نہ سول نافرمانی سے بلکہ وہ میسّر آسکتی ہے صرف اتحاد واتفاق سے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب چھوٹی جماعتوں کے دلوں سے تمام اندیشے نکال دیئے جائیں۔ نہرو رپورٹ خواہ کتنی ہی مناسب نہ رہی ہو اور اب آزادی کا اعلان خواہ کتنا ہی دل خوش کن کیوں نہ ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے دل خطرات سے لبریز ہیں اور عملی زندگی کے تجربات نے ان کو ہندوؤں سے سخت بدظن اور بددل کر دیا ہے۔

اگر آج گاندھی اور نہرو نہایت فراخ دلی سے اس امر کا اعلان کردیں کہ وہ مسلمانوں کی تمام شکایات سننے اور ان کے مداوا کے لئے تیار ہیں ابھی یہ دور تذبذب دور ہو جاتا ہے اور منزل مقصود قریب۔ لیکن ہم کو معلوم ہے کہ یہ نہیں ہوگا اور حصول آزادی کے بعد ایک نہایت المناک قسم کی اندرونی جنگ شروع ہوگی اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس انخلال کا نتیجہ کیا ہو۔ ؂۵۱

نیاز نے جس قدر بے باکی اور جرأت سے ہندو مسلم اتحاد اور اس میں شگاف پیدا کرنے والے مسائل کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے یہ انکی دور اندیشی اور ہر مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور وفکر کرنے کا نتیجہ ہے انھوں نے دونوں طبقوں کو برابر کا ملزم گردانا ہے لیکن اکثریت جو بڑے بھائی کا کردار ادا کرتی ہے اس کے ضمیر کو جھنجوڑا ہے اور قومی رہنماؤں میں گاندھی جی اور پنڈت نہرو سے جو عام مایوسی مسلمانوں کو ہوئی تھی اس کا بے باکانہ اظہار کیا ہے ۱۹۳۰ء میں کھل کر اس طرح بات کرنا بہت بڑی بات ہے۔

۵۱۔ ملاحظات نیاز ص ۶-۷ نگار۔ مارچ ۱۹۳۰ء

مختار زمن

نیاؔز فتح پوری، مجنوںؔ گورکھپوری کی نظر میں

جناب صدر،

یہ نیاز مندان نیاؔز کی محفل ہے۔ مگر یہ سب حضرات اہل نظر بھی ہیں
اس محفلِ ادب میں مجھ جیسے عِلم سے کورے، کور ذوق کا منہ کھولنا سوء ادب ہے
ایک معمولی صحافی کی طرف سے نیاؔز فتح پوری پر مضموں پیش کرنے سے حضرت یوسف
کو سوت کی انٹی کے بدلے خریدنے کا قصہ یاد آیا۔ ڈرتا ہوں کہ سننے والے کہیں یہ نہ کہیں کہ

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

مگر ایک ادنیٰ نیاز مند کی حیثیت سے دل کو اس لئے ڈھارس بندھتی ہے
کہ آج کا موضوع سخن حضرت نیاؔز فتح پوری ہیں۔ تو اے اہل نظر ؎

اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو

جن صاحب کے حکم کی تعمیل کے سلسلے میں یہ مضمون لکھا گیا ہے انکا
نام فرمان اور لاحقہ نام کا فتح پوری ہے۔ جب فرمان نازل ہو جائے تو اس کا بجا لانا
ضروری ہے۔ اس کی فتح پوری ہونے کا یقین ہو تو یوں بھی انکار کی گنجائش نہیں۔
مگر میں محقق، ادیب یا نقاد نہیں ہوں محض ایک معمولی صحافی ہوں
صحافی کے بہت سے فرائض ہوتے ہیں۔ اس کا ایک کام یہ بھی ہے کہ دوسروں کے
خیالات کو اپنے قلم سے لکھ کر پیش کرے۔ ممکن ہے کہ یہی کام بعض شاعر و ادیب
بھی کرتے ہوں مگر جب تک سرقہ پکڑا نہ جائے وہ تخلیقات ان ہی کا شاہکار سمجھی
جاتی ہیں۔ ہم صحافی صاف کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں صاحب کا انٹرویو لیا ہے۔

یعنی بندوق ہماری ہے کندھا دوسرے کا ہے۔ چنانچہ عرض ہے کہ آج کا مضمون لکھا میں نے ہے مگر خیالات حضرت مجنوں گورکھپوری کے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ میں نے نیاز کو مجنوں کی نظر سے دیکھا ہے۔ یہ انٹرویو کیوں لیا گیا؟ وجہ ظاہر ہے۔ مجنوں صاحب اس دور کے بہت بڑے ادیب، نقاد، صاحب علم پروفیسر ہیں۔ ان کا نیاز فتح پوری سے قریبی تعلق رہا ہے وہ نیاز اور اُن کے دور سے واقف ہیں اس لئے ع مستند ہے ان کا فرمایا ہوا۔

لیکن آپ سے کیا پردہ، ایک وجہ اور بھی ہے۔ اس میں کچھ اپنے تساہل کچھ سہل انکاری اور اپنی بے انتہا مشغولیت کا بھی ہاتھ تھا۔ . . میں مجنوں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور نیاز صاحب کے بارے میں باتیں کیں.... مجنوں صاحب جسم کے لحاظ سے ایک نئی کونپل کی طرح نازک اور منحنی ہیں مگر علم کے لحاظ سے ایک صدا بہار تناور درخت کی مانند ہیں۔ ایک موضوع پر بولتے بولتے بیسوں دوسری باتیں بتاتے جاتے ہیں۔ میں نے درخت کو ذرا سا ہلایا کہ پھل پھول کی بارش شروع ہوگئی، جس جس پر نیاز کا نام لکھا تھا وہ چن چن کر لے آیا لیجئے مضمون تیار ہوگیا۔

میں نے مجنوں صاحب سے عرض کیا: اچھا مجنوں صاحب اب راز و نیاز کی باتیں ہو جائیں!! کہنے لگے! سنو نیاز فتح پوری مجھ سے تقریباً بیس سال بڑے تھے۔ میں کالج میں پڑھتا تھا۔ عجیب دور تھا۔ سجاد حیدر یلدرم اور سلطان حیدر جوش وغیرہ نے رومانی تحریک شروع کی۔ اسی گروپ کے ایک ممبر مہدی حسن افادی ہوئے۔ وہ میرے (مجنوں کے) رشتے کے چچا تھے۔ مہدی افادی، خان بہادر میر ناصر علی خاں دہلوی کے پرچوں میں لکھا کرتے تھے۔

عرض کیا:۔ مجنوں صاحب ذرا ٹھہریئے۔ ان میر صاحب کا حال مولانا حامد حسن قادری کی زبان سے سن لیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ میر ناصر علی خاں ۱۸۴۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ایڈیٹری اور مضمون نگاری کے سبب نامور ہوئے۔

انھوں نے تیرھویں صدی اور زمانہ وغیرہ پرچے نکالے آخر میں صلاے عام کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ انھوں نے دلکش اسلوب اور پاکیزہ خیالات کے کے نمونے پیش کئے۔ صلائے عام اور میر ناصر علی خاں کے خیالات کی تمام ادبی دنیا میں دھوم تھی۔ مہدی حسن افادی نے خود میر صاحب کو لکھا کہ "آپ نے اسوقت انشا پردازی کو چمکایا جب بہتوں نے قلم بھی ہاتھ میں نہیں لئے تھے (داستان تاریخ اردو از حامد حسن قادری ص۹۲۲)

میں نے یہ ذکر اس لئے چھیڑا تاکہ اس پس منظر کا نقشہ سامنے آجائے جب نیاز فتح پوری ادبی انشاپردازی کی روایت کو آگے بڑھانے کے لئے میدان میں اتر رہے تھے۔ ہاں مجنوں صاحب اب فرمائیے۔

کہنے لگے :۔ بھئی مہدی افادی کے ساتھ شاہ دلگیر کا نام یاد آتا ہے۔ انھوں نے آگرے سے رسالہ "نقاد" بڑی سرگرمی سے نکالا۔ وہ من چلے پیسے والے خانقاہی آدمی تھے۔ نیاز بھی شامل ہو گئے۔ زبان میں جو سختی اور درشتی آگئی تھی اُسے دور کرنے، دائرۂ فکر اور اندازِ بیان کو وسیع اور دلکش بنانے کا کام ان لوگوں نے شروع کیا اور جب ادب لطیف معرض وجود میں آیا۔ جسے ابیلے لیٹر (e nttre l ettr e ll e r کہتے ہیں۔ اس صدی کی پہلی دہائی میں اس کی داغ بیل پڑی، میں نے عرض کیا :۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ انشا کی یہ شاخ یعنی ادب لطیف دراصل ناصر علی خاں کا حصّہ تھی اور مہدی اُن کے نام پر مٹے ہوئے تھے۔ (نقوش ادب عالیہ نمبر جولائی ۱۹۶۰ء ص۱۲۰)

پھر عرض کیا :۔ مجنوں صاحب یہ بتائیے کہ آپ نیاز صاحب سے پہلی دفعہ کب ملے تھے۔؟ آپ تو شاید انھیں ذاتی طور پر اچھی طرح جانتے تھے؟ مجنوں صاحب نے فرمایا :۔ ہاں بھئی۔ کیوں نہیں۔ مہدی کے ذریعے ان سے واقفیت ہوئی . . . یہ ۱۹۲۵ء کا قصّہ ہے۔ نگار نکل رہا تھا اور نیاز

بہت مشہور ہو چکے تھے۔ وہ جگہ جگہ جاتے تھے اور عزت و احترام کی جگہ پاتے تھے ذی حیثیت لوگوں سے ان کے مراسم تھے۔ گورکھپور ہی میں نگار کا ایک حلقہ پیدا ہو گیا وہاں دوستوں کا ایک گروپ تھا جو ادبی ذوق رکھتا تھا۔ میرے والد جناب فاروقی دیوانہ بھی نیاز کے دوست تھے۔ وہ اولین دور میں مولانا محمد علی کے ہمدرد سے منسلک رہے تھے۔ میں ان دنوں انٹر میڈیٹ میں پڑھتا تھا اور نیاز سے بہت متاثر تھا۔ ہم لوگوں نے نیاز کو گورکھپور بلوایا۔ اہل ذوق کو جمع کیا۔ مختلف ادبی نشستیں ہوئیں۔ ان محفلوں میں ادب کے بہت سے مسائل پر گفتگو ہوتی تھی..... نیاز کے آنے کے بعد گورکھپور میں نگار کا بہت بڑا حلقہ پیدا ہو گیا۔ نگار کے لئے لوگوں سے عطیات بھی دلوائے گئے۔ شہاب کی سرگزشت اور شاعر کا انجام بازار میں آچکا تھا۔

میں نے پوچھا مجنوں صاحب قطع کلام ہوتا ہے جب نیاز صاحب گورکھپور آئے تو ان کی وضع قطع کیسی تھی"؟

مجنوں صاحب: ارے بھئی۔ شیروانی اور علی گڑھ کٹ پاجامہ پہنتے تھے اور منہ پر کالی ڈاڑھی بھی تھی۔ ڈاڑھی تو بعد میں منڈوائی گئی.....

نوجوان نسل نیاز کی گرویدہ تھی۔ اصل سبب تو یہ تھا کہ ان کی رومانیت اور اسلوب کی وجہ سے نوجوان متاثر ہو رہے تھے اور سب کے سب ادب لطیف کے نشے میں چور تھے اور نیاز مولانا ابوالکلام آزاد سے متاثر تھے۔

اس سلسلے میں مجنوں صاحب نے مولانا آزاد، مہدی آفادی اور شاہ دلگیر کے متعلق بہت سی باتیں بتائیں جو بڑی دلچسپ اور کسی حد تک چٹپٹی تھیں۔ مگر میں نے ان کے خیالات کو پھر اصل موضوع کی طرف موڑ دیا۔ کہنے لگے میں ۱۹۲۸ء میں لکھنؤ چلا گیا۔ ان دنوں میں فلاسفی میں ایم۔ اے کر رہا تھا دن رات نیاز سے ملنا جلنا رہتا تھا۔ میں نگار میں تو ۱۹۲۲ء ہی سے لکھ رہا تھا۔ بات یہ ہے کہ نیاز کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی۔ لکھنے پڑھنے کے علاوہ

انھیں موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ لکھنؤ میں جب ان کے گھر جاتا تو دیکھتا کہ ایک بڑا استاد بھی وہاں دکھا رہتا ہے۔ خود مجھ پر شبلی، آزاد اور انگریز مصنفوں کے علاوہ نیاز کا بھی اثر ہے۔ شہاب کی سرگزشت پڑھی۔ بعض پہلوؤں سے اختلاف ہوا۔ مہدی افادی کی صاحبزادی میری سلیج تھیں اور وہ نیاز کی بہت قائل تھیں۔ اُن سے ان مسائل پر باتیں ہوتی تھیں۔ انھوں نے کہا تم بہت سست آدمی ہو۔ آخر تم اس طرح کی کوئی چیز کیوں نہیں لکھتے۔؟ میں نے چیلنج قبول کر لیا۔ اسی روز زیدی کا حشر لکھنا شروع کر دیا مگر پورا نہ کر سکا۔ میری سلیج نے نیاز کو بتا دیا۔ نیاز نے اصرار کیا کہ اسے مکمل کرو چنانچہ مکمل کر ڈالا ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ بھی ہو نیاز کے اسلوب کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ان کے بعد بہت سوں کے اسلوب بن گئے

ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا :۔ مجنوں صاحب سنا ہے نیاز کے الحاد اور مذہبی خیالات کے متعلق بھی چہ میگوئیاں ہوا کرتی تھیں۔ کیا واقعی وہ ملحد تھے۔ ؟

مجنوں صاحب :۔ نہیں بھئی ملحد و لحد نہیں تھے۔ ڈاڑھی والے دور میں تو وہ کٹر مسلمان تھے۔ بعد میں داڑھی منڈا دی مگر ملحد کبھی نہیں ہوئے۔ الحاد کے معنی ہیں نفی، اُن کے یہاں نفی نہیں ملتی، بلکہ خود نگہی ملتی ہے۔ وہ اپنے دین کے دریچوں کے اندر اور اپنے اندر جھانک کر دیکھتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں یہ واقعہ ہے کہ شروع میں مولانا عبدالماجد دریا بادی سے ان کی دوستی تھی۔ جب مسٹر عبدالماجد دریا بادی بی۔ اے، مولانا عبدالماجد دریا بادی بنے اور اس سلسلے میں غلو پیدا ہوا تو چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی۔ خوب خوب لے دے ہوئی ؛؛

عرض کیا :۔ مجنوں صاحب ایک بہت بڑے اور تجربہ کار افسانہ نگار اور مصنف نے مجھ سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میاں، ہم نگار کے دور کی پیداوار ہیں اور اصل میں نیاز و نگار نے ہمیں تشکیک میں مبتلا کر دیا۔ بلکہ پوری ایک نسل کو یہ مرض لاحق ہو گیا۔ بس ؛؛

مجنوں صاحب :۔ میں یہ کہوں گا کہ نیاز معاشرے کی، اپنے ملک کی، بلکہ

ایشیا کی روایات کو چیلنج کرتے تھے۔ اپنے دور میں نئی نسل کے لئے "فکری بے دریغی" اُن کی دین ہے۔ ان کا مقولہ تھا کہ "سوچو اور کہہ ڈالو۔ یہ پروا نہ کرو کہ کوئی دوسرا کیا کہتا ہے۔"

وہ آزادئ رائے کے قائل تھے۔ اور دوسروں سے بات اخذ کرنا بھی خوب جانتے تھے۔ یہ ترکہ انھیں ابوالکلام سے ملا تھا۔ وہ صاحب طرز تھے اور وسیع النظر تھے۔ ان کے خیالات میں جدّت نہ تھی مگر اسلوب میں ضرور تھی۔ وہ حسن کے قائل تھے۔ زندگی بھر نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

نگار نے بہت سے نوجوان لکھنے والوں کی تربیت کی۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کو انھوں نے لکھنے کی ترغیب دی۔ فراقؔ رسالہ زمانہ میں لکھتے تھے۔ میں نے اُن کی چند غزلیں نیازؔ کو بھیجیں نیاز نے پسند کیں، مزید کی فرمائش کی اور پھر تو نیازؔ و فراقؔ کے مراسم بہت قریبی ہو گئے . . . .

نیازؔ فتح پوری شروع میں پولیس کے محکمے میں ملازم رہ چکے تھے۔ شاید اسی لئے مزاج میں ڈسپلن اور سخت گیری کی عادت پیدا ہو گئی تھی۔ اُن کے ہر کام کا وقت مقرر تھا۔ گھر اور دفتر ایک ہی تھا۔ سب کام باقاعدگی سے ہوتے تھے۔ لکھنے پڑھنے سے شغف رہتا تھا۔ نیازؔ بہت تھم تھم کر گفتگو کرتے تھے۔ لوگوں پر ان کے اسٹائل کا رُعب تھا۔ سنجیدہ مزاج آدمی تھے مگر خشک مزاج نہیں تھے . . .

میں نے کوئی بڈھا ایسا نہیں دیکھا جو نوجوانوں کی ترقی سے اتنا خوش ہوتا ہو جتنا نیازؔ فتح پوری۔ جب مجنوں صاحب یہ بات کہہ رہے تھے تو میں دل میں سوچ رہا تھا کہ میں نے بھی کوئی بڈھا ایسا نہیں دیکھا جو نوجوانوں سے اتنا خوش ہوتا ہو جیسے خود یہ حضرت سلامت مجنوں گورکھپوری ہوتے ہیں . . . . یہ سب بڈھے ہماری ادبی روایت والی اور اس طویل شاہراہ کے سنگ میل ہیں اور ان کا علم و فضل صدقۂ جاریہ ہے۔ ان سے سیکھو، ان سے الجھو، ان سے مقابلہ کرو، مگر ان کی قدر و منزلت میں کمی نہ کرو۔ ان کا سایہ سر پہ نہ ہو تو نئی پود زمانے کی تپتی دوپہر میں جھلس کے رہ جائے

نگار ادیبوں کی نرسری تھی، اور نیاز اس کے مالی۔ انھوں نے بڑے چاؤ سے نئے پودے تیار کئے جو بعد میں تناور درخت بن گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پھر فرمان خداوندی ہوا کہ نگار لکھنؤ سے کراچی آئے تو یہ آگیا۔ مگر نیاز چلے گئے کراچی میں میٹھا پانی کم ہے، ہوا میں کھار ہے، کھاد دستیاب نہیں ہوتا۔ مگر کسی نہ کسی طرح نگار کی نرسری کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری چلا رہے ہیں۔ لڑکے پڑھاتے ہیں، کتابیں لکھتے ہیں، رسالہ نکالتے ہیں اور خوش رہتے ہیں۔ سب کام جاری ہیں۔ یہ بھی شاید نیاز کا اثر اور عرفانِ محبت کا معجزہ ہے۔

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں

ص ۳۳ سے آگے

(۲)۔ دیوان غالب مع شرح طبع اول ۱۹۰۵ء طبع دوم ۱۹۰۷ء

(۳)۔ مشاہدات زنداں (۱) اردوئے معلّٰی دسمبر ۱۹۰۹ء تا جنوری ۱۹۱۱ء (۲) کتابی صورت میں ۱۹۱۸ء میں جبلپور سے شائع ہوا۔

(۴) نکاتِ سخن۔ پہلے پہل ۱۹۱۹ء تذکرۃ الشعرا میں بعد ازاں اردوئے معلّٰی اور کتابی صورت میں

(۵) ارباب سخن کانپور ۱۹۲۹ء

(۶) انتخاب سخن۔ گیارہ جلدوں میں انتخاب سخن کے نام سے تقریباً دو سو شعرا کے دواوین کے منتخبات شائع کئے۔

کلام حسرت کا انگریزی ترجمہ مولانا حسرت نے اپنی منتخب غزلوں کا انگریزی ترجمہ کیا تھا یہ ترجمہ پہلی بار ۱۹۲۲ء میں مرکنٹائل پریس کانپور سے دوسری بار ۱۹۷۶ء میں کراچی سے شائع ہوا۔

نیاز فتحپوری (مرحوم)

درسِ محبّت

معبدِ زہرہ کی کنواریاں سب کی سب پاکباز رہی ہوں یا عصمت فروش، اس سے بحث نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دردانہ زہرہ کی پرستش اس کو عصمت کی دیوی ہی سمجھ کر کرتی تھی اور جس وقت وہ معبد سے تجدیدِ تقدس کے بعد باہر نکلتی تو لوگ ایسا محسوس کرتے کہ شاید دنیا میں تخلیق کی ابتدا ابھی ہوئی ہے اور قلبِ انسانی ان ضروریات سے ہنوز نا آشنا ہے جو خون میں ناجائز گرمیات پیدا کر کے رُوح کو آہستہ آہستہ ذا غدار کرتے رہتے ہیں۔

یونان کے مذہبی دورِ حسن پرستی کا یہ وہ زمانہ انحطاط تھا جب یونان کا ایک ایک نوجوان قلب الگ الگ ایک مخصوص زہرہ کا معبد بنا ہوا تھا اور مذہب ان کے ہاں نام تھا محض اُس زندگی کا، جس کی ترکیب صرف عورت، شباب، حسن اور عشق کے عناصرِ اربعہ سے ہوئی تھی۔

خانقاہِ زہرہ کا ایک ایک حجرہ، باغ معبد کا ایک ایک کنج جہاں کسی وقت حُسنِ فطرت کی پرستش ہوا کرتی تھی جو کسی زمانے میں مخصوص تھا صرف جمیل مناظرِ قدرت کے مطالعہ کے لئے اب ایک خلوت کدہ تھا، جہاں عصمت "آغشتہ بہ خون" اور محبت "مائل بہ جنوں" نظر آتی تھی۔

ملک کا کوئی نوجوان ایسا نہ تھا جس نے اپنی عمر کے سیکڑوں دن اس سعی میں بسر نہ کر دئے ہوں کہ اس فضا کی کم از کم ایک ہی معطر رات اسے میسر آجائے اور مشکل سے کوئی آشفتہ شباب ایسا ملے گا جس نے ایک مرتبہ اس میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد دنیا میں پھر کسی اور لذت کی خواہش کی ہو۔

دردانہ ایک امیر خاندان کی لڑکی تھی جس کو اس کے والدین نے ایک خواب کی ہدایت کے مطابق خانقاہِ زہرہ کے لئے وقف کر دیا تھا اور جس کی کمسنی یہیں کی سم آلود فضا میں

ریعانِ شباب تک پہنچی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یوں تو خانقاہ کی ہر کنواری اپنی اپنی جگہ ایک بے پناہ مجسمۂ حسن و شباب تھی لیکن وردانہ! اس کا تو یہ عالم تھا جیسے فطرت کے کسی حسین خواب نے انسانی صورت اختیار کر لی ہو۔

لوگ کہتے تھے کہ وردانہ سے زیادہ حسین ہونا گویا خدا ہو جانا ہے اور شاید یہی وہ جذبہ تھا جس نے ابھی تک کسی کے دل میں اس کے پاس "التجائے غیر معصوم" لے جانے کی ہمت پیدا نہ ہونے دی تھی۔ لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ گذشتہ دو سال کے اندر جب سے اس نے نمود شباب کے بعد حسب دستور نقاب پوش ہو کر نکلنا شروع کیا تھا۔ لوگوں کی تمناؤں میں کس قدر تلاطم برپا کر دیا تھا۔ اور ان کا تخیل اس کے نقاب پوش حسن کو کس کس انداز سے عریاں دیکھا کرتا تھا۔

یوں تو ملک کا ہر وہ شخص جس کی رگوں میں خون دوڑ رہا تھا، وردانہ کے لئے یکسر اضطراب شوق بنا ہوا تھا لیکن سب سے زیادہ نمایاں اور اپنے آپ کو مستحق کامیابی سمجھنے والی ہستی شہزادہ نیرو بی کی تھی۔ جو نہ صرف اپنے حسن و صورت بلکہ اکتسابات ذہنی کے لحاظ سے بھی اس وقت یونان کا ایک ہی نوجوان تھا۔

چاندنی رات تھی خانقاہ کے نیچے بہنے والی ندی میں چاند نے چراغاں کر رکھا تھا اور وادی پر سکونِ مطلق طاری تھا کہ دفعتاً اس سکون میں تبدیلی پیدا ہوئی اور ساحل کے ایک جانب سے بربط کے تاروں کی نازک لرزش آ آکر ہوا میں ملنے لگی رفتہ رفتہ اس لرزش کا تواتر بڑھا، جھنکار میں زور پیدا ہونے لگا اور فضائی آواز موسیقی بن کر تاروں پر دوڑنے لگی۔ وردانہ کا معمول تھا کہ کبھی کبھی وہ رات کو تنہا نکل کر ساحل پر آ جاتی اور دیر تک بیٹھی ہوئی بربط کے ساتھ گایا کرتی۔ اس کا گانا حقیقتاً ایک قسم کی عبادت تھی۔ اس کی موسیقی گویا اس کی پرستش کی زبان تھی جس کے سمجھنے والے اور جس سے اثر لینے والے اسے کہیں نظر نہ آتے تھے اور اس لئے وہ جنگل ہی کی بے جان چیزوں کے سامنے اپنا فلسفہ بیان کیا کرتی اور یہیں کبھی ہنستی ہوئی اور کبھی آنسو خشک کرتی ہوئی واپس جاتی۔

سفید چادر چاندنی رات، اور وردانہ کا بے نقاب حسن صبیح حقیقت یہ ہے کہ

اس نقرئی لوح پر نقش سیمیں شکل سے اُبھر سکتا۔ اگر اس کے بالوں کی گہری سیاہی اس یکسانیت کو دُور کرنے والی نہ ہوتی۔ وہ ایک چٹان پر پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھی تھی اور بربط پر اپنی لانبی نازک انگلیوں سے اپنی داستان پرستش کہہ رہی تھی۔

جب رات زیادہ بلند ہوچکی اور چاند بلند ہوکر درّدانہ کے سر سے گذرنے لگا تو اس نے اُٹھنے کا ارادہ کیا لیکن وہ کھڑی ہونا چاہتی تھی کہ سامنے کے کنج سے ایک انسان سفید چادر میں ملفوف آگے بڑھتا ہوا نظر آیا پہلے تو وہ کچھ ڈری لیکن چونکہ ایک پاکباز دل دُنیا میں کسی چیز کی طرف سے عرصہ تک خائف نہیں رہ سکتا، اس لئے وہ پھر اطمینان سے وہیں بیٹھ گئی اور جب وقت آنے والے نے اس کے استفسار کے جواب میں اپنا نام نیرو بی بتایا تو درّدانہ تعظیماً کھڑی ہوگئی اور بولی کہ شاہزادے کو کس چیز نے ایسے ناوقت اس قدر زحمت برداشت کرنے پر مجبور کردیا۔

نیرو بی بولا "کیا وہ خاتون جس کو دنیا میں سب سے زیادہ حسین ہونے کا امتیاز حاصل ہے اس بات کو نہیں سمجھ سکتی، کہ نیرو بی۔ جس کی زندگی میں اب کوئی وقت۔ وقت کہلائے جانے کے قابل نہیں رہا۔ مگر وہ جو کسی حقیقی حُسن کے سامنے بسر ہو کیوں ایسے ناوقت اس قدر زحمت برداشت کرنے پر مجبور ہوگیا"۔

درّدانہ یہ سُن کر صرف ہنس دی۔ نیرو بی سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا — "جس نے تیرا منہ ان پاکیزہ موتیوں سے بھرا ہے کیا وہ تجھے اس امر پر مجبور نہیں کرسکتا کہ تو میری قسمت کا آخری فیصلہ سنا دے"۔

درّدانہ بولی "آہا! شاہزادہ نیرو بی تو بہت اچھا شاعر ہے" اور یہ کہہ کر پھر ہنس دی شاہزادہ نیرو بی بولا "اُف! درّدانہ گھڑی گھڑی نہ ہنس کیونکہ چاندنی رات میں بابونہ کے پھولوں کی بہار مجھے از خود ......"

درّدانہ۔ "خوب! پھر وہی شاعری، اے شاہزادے! تو نے یہ فن کہاں اور کب سیکھا؟ اگر میں رات بھر ہنستی رہوں تو بھی شاید تیری نئی نئی تشبیہوں کا سلسلہ ختم نہ ہو۔ میں نے بھی ایک مرتبہ کوشش کرکے ایک شعر کہا تھا لیکن وہ بہت معمولی تھا۔

نیروبی :۔ "مجھے سناؤ! یقیناً وہ بہت اچھا ہوگا"

درردانہ :۔ "نہیں، وہ نہایت معمولی ہے، اس میں کوئی تشبیہہ نہیں۔ مجھے نہیں معلوم تشبیہہ کسے کہتے ہیں اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے"

نیروبی :- "تمہارے لئے یہ معمولی بات ہوگی لیکن میرے لئے تو ہر وہ لفظ سکون جان ہے جو درردانہ کے منہ سے نکلے"

درردانہ :- مجھے شرم آتی ہے۔ تم سن کر مجھ پر ہنسو گے، اور ہاں اب تو مجھے وہ یاد بھی نہیں رہا کوشش کروں تو شاید صرف خیال ظاہر کرسکتی ہوں"

نیروبی۔ اچھا وہی سہی، خیال ہی سہی"

درردانہ :- "ایک دن میں معبد میں دیوی زہرہ کے سامنے سر زمین پر رکھے ہوئے رو رہی تھی کہ اسی حالت میں مجھے نیند آگئی۔ میں نے ایک خواب دیکھا جو نہایت دلکش تھا۔ صبح کو نہایت مسرت کے عالم میں جب اپنا بربط میں نے لیا تو بے اختیار میری زبان سے ایک شعر نکل گیا۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ :۔

"وہ لوگ جو میرے جسم کو چاہتے ہیں ان سے کیونکر کہوں کہ میری روح تو اس سے کہیں زیادہ حسین ہے۔ میرے چہرے کو بے نقاب دیکھنے کی آرزو رکھنے والے کاش میری روح کو بے حجاب دیکھتے۔ مگر افسوس کہ صورت پر جان دینے والے بہت ہیں اور مجھ سے محبت کرنے والے کم"

دیکھو! میں کہتی نہ تھی کہ تم ہنسو گے، واقعی نہایت بھدا خیال ہے۔ شاعری کی اس میں کوئی بات نہیں پائی جاتی :

نیروبی :- "مجھے دھوکا نہ دے، تو نے کبھی کوئی شعر نہیں کہا۔ میں ایسا بیوقوف نہیں، جو سمجھ نہ سکوں، تو نے مجھے سمجھانے کے لئے مجھ کو تنبیہہ کرنے کے لئے ایک بات بنائی ہے۔ یہ تو نے کیسے جانا کہ میں صرف تیرے جسم کا پرستار رہوں صرف تیری صورت کا شیدائی ہوں"

درردانہ :- "ہاں یہ تم نے کیا کہا؛ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے

ہوا اس سے قبل جب کبھی تم نے مجھ سے باتیں کیں میں نے ان کو ہمیشہ وہ التفات سمجھا جو ایک بادشاہ کی طرف سے غریب گدا پر ہوا کرتا ہے، مجھے تو کبھی اس کا وہم وگمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ والئ یونان کا بیٹا مجھ ایسی ذلیل و خوار ہستی کے لئے اپنی زندگی کا کوئی لمحۂ محبت کبھی صرف کر سکتا ہے۔ تو کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ واقعی محبت کرتے ہو، میں کیسے یقین کروں؟

نیروبی۔ دُردانہ یقین کر کہ وہ نیروبی، جو ملک کی بہتر سے بہتر لڑکی کے ساتھ شادی کر سکتا ہے، ایک زمانہ سے تیرا دیوانہ ہے اور ہرچند وہ اب تیرے چہرے کو بے نقاب نہیں دیکھ سکتا لیکن تیرے حسن و جمال کے خوابوں سے اب بھی اس کی نیندیں معمور ہیں اور تیرے جلوے کی یاد سے اس کی راتیں روشن ہیں۔

دُردانہ۔ حسن و جمال! جلوہ!! میں ان کے صحیح مفہوم سے ناواقف ہوں، کیا اچھی صورت کو حسن و جمال کہتے ہیں، چہرہ کا یاسمین، رُخسار کا گلاب، آنکھ کا نشہ، ابرو کی محراب، جسم کا تناسب، لبوں کی تازگی، دانتوں کی گہرآبی، رنگ کی تازگی، جن کا ذکر اکثر شاعروں کی زبان پر رہتا ہے کیا انھیں چیزوں کا نام حسن ہے۔ کیا انھیں باتوں کو جمال کہتے ہیں۔ اور کیا انھیں چیزوں کا بے نقاب ہو جانا جلوہ کہلاتا ہے۔ اگر دنیائے عشق و محبت کا فلسفہ صرف اس قدر ہے تو مجھے حیرت ہے کہ اس بے بنیاد جذبہ نے کیوں کر ایسی وسعت حاصل کر لی اور فطرت کیوں اپنی توہین گوارا کر رہی ہے۔ مگر آپ شہزادے ہیں اور آپ کے خیالات و جذبات بھی یقینی عام سطح سے بلند ہوں گے اس لئے شاید آپ کے حسن و جمال کا مفہوم اس قدر ادنیٰ و پست نہ ہوگا۔

نیروبی۔ بے شک عام شاعروں کے ہاں اور معمولی انسانوں کے نزدیک حسن و جمال کا مفہوم وہی ہے جو تم نے ابھی ظاہر کیا لیکن میں تو ان لوگوں میں ہوں جو صورت سے زیادہ ادا کو دیکھتے ہیں۔ جو اعضا کے حسن سے زیادہ اطوار کی دل فریبی پر فریفتہ ہوتے ہیں اور غالباً یہی وہ چیز ہے جو تجھ میں بدرجۂ کمال پائی جاتی ہے۔

دُردانہ۔ ادا! اطوار!! آہ، شاعروں اور عاشقوں کی اصطلاحیں سمجھنا بھی کس قدر دشوار ہے۔ آپ یقین کیجئے کہ میرا ذہن ان دونوں کے مفہوم سے بھی بالکل خالی ہے ادا

شاید میں کبھی نہ سمجھ سکوں گی کہ ان کا حقیقی مطلب کیا ہے۔ کیونکہ اس سے قبل بھی بارہا جب میں نے شاعروں کے کلام پر غور کیا تو میں باوجود کوشش کے کبھی نہ سمجھ سکی کہ ادا اور اس کے ساتھ بہت سے الفاظ مثلاً غمزہ، کرشمہ، عشوہ، ناز، تیور، چتون، بانکپن، پھبن وغیرہ کسے کہتے ہیں۔ اور ان میں کیا فرق ہے۔ آپ نے ابھی ادا اور اطوار کا ذکر کیا۔ اس لئے کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اگر آپ نے میرے اندر ان باتوں کو دیکھ کر محبت کی ہے تو یہ چیزیں مجھ میں کہاں ہیں۔؟"

نیروبی۔ دُردانہ! تو یہ کیسی گفتگو کر رہی ہے۔ تجھ ایسی مکمل عورت جو یونانی انشاء عالیہ کی ماہر ہو۔ جو فنون لطیفہ میں اپنا نظیر نہ رکھتی ہو جو اچھی طرح اس کیفیت سے واقف ہو کہ سارا یونان اس کا فریفتہ ہے ایسی اَن جان بن جائے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں تو مجھ کو اس وقت بے وقوف بنا رہی ہے۔ اور پھر اے قنالۂ عالم مجھی سے پوچھتی ہے کہ ادا کسے کہتے ہیں۔ اچھا میں پوچھتا ہوں کہ تجھے چاندنی رات کیوں اچھی معلوم ہوتی ہے تجھے اپنے بربط سے کیوں محبت ہے۔ تو موسیقی کی کیوں دلدادہ ہے۔ اگر تو کسی اور طرح نہیں سمجھ سکتی تو یوں سمجھ لے کہ تو میری چاندنی ہے۔ تو میری ہستی کا بربط ہے اور میری رُوح کو بیتاب کر دینے والا نغمۂ شیریں"

دُردانہ:"چاندنی تو مجھے اس لئے اچھی معلوم ہوتی ہے کہ میں اس میں زیادہ جوش سے اپنے بربط کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتی ہوں اور اپنے سازو موسیقی سے اس لئے لگاؤ ہے کہ یہ میری پرستش ہے۔ یوں سمجھ لو کہ چاندنی رات سُنہرا فرش ہے جس پر بیٹھنے کے بعد بربط کے تاروں پر میری انگلیوں کی لرزش اور گلے سے نکل کر آواز کی نیایش عبادت بن جاتی ہے اور اگر میرے دل سے یہ کیفیت محو ہو جائے تو میرے لئے ان میں سے ایک چیز بھی توجہ کے قابل نہ رہے"

نیروبی:"اے میرے دل کی دیوی! میں بھی تجھ سے محبت نہیں کرتا بلکہ تجھے پُوجتا ہوں۔ میں نے غلطی کی کہ اپنے حال کو "محبت" کے لفظ سے ظاہر کیا۔ اور اس سے زیادہ غلطی یہ کی کہ تجھے حسین وجمیل کے لقب سے یاد کیا۔ حالانکہ تو اس سے بھی بلند کوئی اور چیز ہے جس کے ظاہر کرنے کے لئے انسان کے الفاظ عاجز ہیں۔ زیادہ سے زیادہ

اگر میں کہہ سکتا ہوں تو صرف یہ کہ تو میری معبودہ ہے۔ تو میری دیوی ہے۔ اور میں تیرا پرستار ہوں، تیرا پجاری ہوں"

دردانہ "کیا یہ صحیح ہے؟ لیکن تم دردانہ کی پرستش کرتے ہو یا میری؟"

نیروبی "میں نہیں سمجھا، کیا دردانہ اور تو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں؟"

دردانہ "ہاں دردانہ نام ہے اس جسم کا جو اس وقت تمہیں نظر آرہا ہے۔ اور جو ہر وقت تغیر پسند و فنا پذیر ہے اور میں تو یہ جسم نہیں ہوں"

نیروبی "پھر کیا ہو؟"

دردانہ "میں نام ہے فطرت کا، روح کا، وجدان کا۔ جس میں ہر وقت رفعت ہے۔ بلندی ہے۔ ارتقاء ہے"

نیروبی "تو پھر میں دردانہ سے محبت نہیں کرتا۔ بلکہ تجھ سے۔ تجھی کو چاہتا ہوں"

دردانہ "مگر ایک زمانہ آئے گا جب میری صورت خراب ہو جائے گی، دردانہ مکروہ ہو جائے گی۔ کیا تم اس وقت بھی مجھ پر یہی محبت صرف کرو گے؟"

نیروبی "یقیناً"

دردانہ "اچھا اگر یہ صحیح ہے تو پھر میرا فیصلہ یہی ہے کہ دردانہ نیروبی کی ہو سکے یا نہ ہو سکے لیکن میں تمہاری ضرور ہوں اور پرسوں شام کو اسی خلوت گاہ میں اپنے آپ کو تمہارے سپرد کر دوں گی"

نیروبی، اس وقت اپنے آپ کو صحیح معنی میں بادشاہ سمجھنے لگا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ دردانہ ایسی ہستی پر قابو پالینا گویا دنیا فتح کر لینا ہے۔ اس لئے وہ غیر معمولی مسرت و نشاط کی کیفیت لئے ہوئے واپس گیا اور انتظار کے دو دن گزارنا اس کے لئے دشوار ہو گیا۔

۲

آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ شفق کی روشنی ہاتھوں کی حنائی کی طرح آہستہ آہستہ مٹتی جارہی تھی۔ اور نیروبی دو گھنٹے سے ساحل پر دردانہ کا انتظار کر رہا تھا کہ شام

کے دھندلکے میں کچھ فاصلے پر ایک نقاب پوش عورت آتی نظر آئی اور نیروبی اس کے لینے کے لئے آگے بڑھا۔ اس نے دردانہ کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا لیکن اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مگر وہ کچھ نہ بولی۔ اس نے اپنے جسم کو اس کے جسم سے ملا دیا لیکن وہ خاموش رہی۔ نیروبی کی مسرت کا اس وقت کیا اندازہ ہو سکتا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ کائنات کی تخلیق ہی صرف اس کی آرزوئیں پوری کرنے کے لئے ہوئی ہے اور آج اسے حق حاصل ہے کہ جس کو جس طرح چاہے چلائے۔

ساحل کی اس چٹان پر پہونچ کر جہاں اب سے دو دن قبل عہد و پیمان ہوا تھا، دردانہ نیروبی سے علیحدہ ہو کر کھڑی ہو گئی اور بولی کہ تم میری آواز پہچانتے ہو؟" نیروبی بولا "کیوں نہیں، کیا کوئی شخص ایسی شیریں آواز کو ایک مرتبہ سننے کے بعد اپنے دماغ سے محو کر سکتا ہے"

دردانہ نے کہا "تم میرے قد و قامت سے بھی مجھے جان سکتے ہو؟" نیروبی نے کہا "خوب! کون ہے جو اس سرو خراماں کا نظارہ کرنے کے بعد پھر اسے فراموش کر سکے"

دردانہ "میں نے گزشتہ دو راتیں معبد کے اندر صرف اس دعا میں صرف کر دی ہیں کہ اگر نیروبی واقعی صرف میری روح سے محبت کرتا ہے تو میری صورت میں کوئی تغیر ایسا کر دیا جائے جو دنیا کے اس سب سے زیادہ انوکھے عہد و پیمان کی یادگار بن سکے، اور مجھے یقین ہے کہ میری یہ دعا قبول ہوئی ہوگی۔ اس لئے میں نقاب الٹتی ہوں، میرے چہرے کو بھی دیکھ کر پہچان لو کہ واقعی میں دردانہ ہوں یا نہیں؟"

یہ کہہ کر جس وقت دردانہ نے اپنا نقاب اٹھا اور نیروبی کی نگاہ اس پر پڑی تو حیرت نے اس پر سکتہ طاری کر دیا۔ کیونکہ دردانہ کے حسین چہرے کے بجائے ایک ایسی کریہہ صورت اس کے سامنے تھی کہ مشکل سے وہ اس کو نگاہ بھر کر دیکھ سکتا تھا، تمام جلد پر گہرے چیچک کے داغ۔ ناک بیٹھی ہوئی۔ آنکھیں چھوٹی۔ بھوریں ندارد۔ پیشانی تنگ ہونٹ موٹے موٹے یہ تھا دردانہ کا چہرہ جو نیروبی کو نظر آیا۔

دردانہ، دیر تک نیروبی کی اس حیرت سے لطف اٹھاتی رہی اور پھر بولی "لیجے

شہزادے جلدی کیجئے اور مجھے اپنے ساتھ لے چلئے میں آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے کے سامنے اس کے پاکیزہ و مقدس جنگل میں عہد کرنے آئی ہوں کہ میں ہمیشہ آپ کی ہو کر رہوں گی، اور اپنی تمام رُوحانی برکتیں ولذتیں آپ کے لئے وقف کر دوں گی۔"

نیروبی حیران تھا کہ سوائے چہرے کے یہ عورت اور سب طرح دردانہ ہی تھی۔ لیکن اس کی صورت میں یہ تغیر کیسے ہو گیا کیا واقعی اس کی دُعا قبول ہو گئی یا کسی اور عورت کو بھیج کر مجھے دھوکا دیا جا رہا ہے۔ وہ اس مسئلہ پر غور ہی کر رہا تھا کہ دردانہ نے پھر تقاضہ کیا اور بولی کہ "اے شہزادے یہ سکوت کیسا، یہ حیرت کیوں، اپنے وعدے کو بھول گئے۔ کیا تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ میری پرستش کرتے ہو۔ ممکن ہے کہ میں دردانہ نہ ہی ہوں۔ لیکن میں تو ہوں، پھر یہ پس وپیش کیا۔؟"

نیروبی جس کو اس کی گفتگو کا اب بالکل یقین ہو گیا تھا کہ واقعی دردانہ ہے اس کی صورت حقیقتاً مسخ ہو گئی ہے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا کہ اسے دردانہ نہیں اب میں تجھے دردانہ نہیں کہہ سکتا۔ اے عورت! معاف کر مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے اپنے جذبہ کا صحیح اندازہ نہیں کیا تھا اور ایک ایسا وعدہ کر لیا تھا ....

جس کو اب میں پورا نہیں کر سکتا۔ جوا ایسے کریہہ ملبوس میں ظاہر ہو۔ میں تجھے اپنی بیوی بنا کر کیونکر مخلوق کو اپنا چہرہ دکھا سکتا ہوں اور کس طرح اس تنفر وکراہت کو دور کر سکتا ہوں۔ جو تیری صورت دیکھ کر میرے دل میں پیدا ہوئی ہے۔؟"

دردانہ یہ سُن کر ہنسی، اور بولی کہ "اے شہزادے تمہاری خوشی، میں نے تم کو مجبور نہیں کیا تھا۔ بلکہ تمہیں نے میرے سامنے التجا پیش کی تھی۔ اس لئے یاد رکھو کہ اگر آئندہ کبھی تمہیں نقضِ عہد پر افسوس کرنا پڑے تو اس کا الزام مجھ پر نہ رکھنا۔"

دردانہ نے یہ کہا اور نقاب ڈال کر وہاں سے چل دی۔

۳

گذشتہ واقعہ کو دو ماہ کا زمانہ گذر گیا ہے، اور خانقاہِ زہرہ کے احاطے میں کسی مخصوص تقریب کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ معبد زہرہ میں یہ رسم نہایت پابندی کے ساتھ جاری تھی کہ جس وقت کسی کنواری کی عمر ۱۹ سال کی ہو جاتی تھی تو عام جلسہ کیا

جاتا تھا اور اس کو انتخاب شوہر کی اجازت دی جاتی تھی۔ چنانچہ آج دردانہ اپنی عمر کے اٹھارہ سال پورے کر چکی تھی اور اس کو خانقاہ کی پرستارانہ زندگی ترک کر کے متاہل زندگی میں داخل ہونا تھا۔

چونکہ دردانہ کے حسن و جمال، فضل و کمال کا بہت شہرہ تھا، اور اس تاریخ کا اعلان تمام قرب و جوار کے ملکوں میں بھی کر دیا گیا تھا۔ اس لئے خواہش مندوں کا ہجوم بہت تھا۔ اور ہر ملک کا امیرزادہ بہترین ہدایا لے کر حاضر ہوا تھا۔ نیرو بی اس رات کی صبح ہی کو اپنا غم و غصہ دور کرنے شکار کے لئے چلا گیا تھا اور پورے دو ماہ کے بعد اس رات کو واپس آیا جس کی صبح کو یہ تقریب عمل میں آنے والی تھی۔

اس نے سنا اور اپنے جی میں ہنسا کہ دیکھئے وہ کون بدقسمت ہے جو دردانہ کی شہرت جمال سے دھوکا کھا کر اس عذاب کو مول لے گا۔ صبح کو وہ بھی تماشہ دیکھنے گیا لیکن لوگوں کو سخت تعجب ہوا، جب انھوں نے سنا کہ نیرو بی جو دردانہ کا صدر درجہ شیفتہ تھا کوئی ہدیہ لے کر نہیں آیا اور فہرست میں اپنا نام بھی درج نہیں کرایا۔ کوئی پوچھتا بھی تو ہنس دیتا اور کہتا کہ "ہاں دردانہ کی خواہش اب میرے دل کے اندر مردہ ہو گئی ہے"۔ لیکن جب اس سے زیادہ اصرار کیا گیا تو اس نے اپنے بعض احباب سے اصل واقعہ بھی بتا دیا اور رفتہ رفتہ یہ خبر دوپہر تک پوری طرح منتشر ہو گئی اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ فکرمند نظر آنے لگا۔ خانقاہ کے پجاریوں سے دریافت کیا گیا، وہاں کی کنواریوں سے جستجو کی گئی، لیکن سب نے یہی جواب دیا کہ اب سے دو ماہ قبل تو دردانہ کی صورت نہایت اچھی تھی لیکن گذشتہ دو مہینہ کے اندر اس نے اپنے چہرے کا نقاب بہت سنگین کر دیا ہے اور کسی کو اس کی صورت دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ ممکن ہے کہ دیوی نے اس کی صورت مسخ کر دی ہو اور اس کے چھپانے کے لئے وہ اپنی صورت دکھانے سے احتراز کرتی ہو۔ رفتہ رفتہ یہ خبر اس قدر عام ہوئی اور اس درجہ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ سب نے اپنی اپنی خواہشیں واپس لے لیں، اور شام کو جب صحن خانقاہ میں زریں تخت پر دردانہ بیٹھی تا کہ ہر خواہشمند سامنے آ کر اپنی التجا پیش کرے اور وہ اس کا جواب دے تو ایک متنفس بھی سامنے نہ آ

نام پکارا جاتا تھا۔ لیکن مجمع سے نکل کر کوئی شخص آگے نہ بڑھتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سارے نام ختم ہو گئے۔ فہرست میں اب صرف ایک نام رہ گیا تھا جو سب سے آخیر میں اس لئے رکھا گیا تھا کہ وہ ایک نہایت ہی معمولی کسان کے لڑکے کا تھا۔ جب سب نام ختم ہو گئے تو اس کا نام بھی پکارا گیا۔ اور وہ ڈرتا کانپتا آگے بڑھا اور تخت کے پاس پہنچ کر بولا کہ: "اے دُرّدانہ! میں نے تیری خواہش اس لئے نہیں کی کہ تو حسین و جمیل ہے بلکہ صرف اس لئے کی تھی کہ دنیا میں مجھے ایک رُوح کی ضرورت تھی جو میری رُوح کی تڑپ کو دُور کر دے اور مجھے سچی پرستش کا سبق دے۔ میں نے سُنا تھا کہ تو بڑی بلند فطرت لڑکی ہے اور تیری پوجا سے زہرہ کی خانقاہ جگمگا اٹھتی ہے۔ پھر یہ بھی خدا کی قدرت ہے کہ اس نے تیرا ظاہری حسن و جمال چھین لیا۔ اور کوئی نوجوان تیرے ہاتھ کا خواہاں آگے نہ بڑھا۔ یہاں تک کہ میرا نام پکارے جانے کی نوبت آئی۔ اس لئے میں حاضر ہوا ہوں۔ کیا تیری پاکیزہ رُوح میری آلودہ رُوح کے اتصال کو گوارہ کر سکے گی۔؟"

مجمع پر ایک سکوت طاری تھا اور ہر شخص منتظر تھا کہ دیکھئے دُرّدانہ کیا جواب دیتی ہے۔ کہ نقاب کے اندر سے ایک نازک شیریں آواز آئی۔

"اے اجنبی! چونکہ تو صرف میری فطرت کا گرویدہ ہو کر آیا ہے۔ اس لئے یقیناً میں تیری خواہش کو رد نہ کروں گی۔"

اور یہ کہہ کر اس نے نقاب اٹھا دیا۔ کیونکہ انتخاب کی رسم ادا ہونے کے بعد ایسا کرنا ضروری تھا۔ لیکن نقاب کا اٹھنا تھا کہ سارے مجمع میں ہلچل مچ گئی۔ کیونکہ اس وقت دُرّدانہ بالکل چودھویں کا چاند معلوم ہوتی تھی اور اس کے حسن و جمال کی تاب نظارہ بھی لوگوں میں نہ تھی۔

نیروبی، دیوانہ وار آگے بڑھا اور بولا: "اے دُرّدانہ! یہ کیا، ایسا سخت فریب!!"

دُرّدانہ مسکرا کر بولی: "فریب تو تیری ہی مکروہ فطرت کا تھا جس نے اپنی صورت میرے چہرے میں مشاہدہ کیا ورنہ تو جیسی اب ہوں ویسی ہی اس وقت بھی تھی۔"

یہ کہہ کر دُرّدانہ اٹھی اور کسان کے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر اس گاؤں میں چلی گئی جہاں۔

وہ رہتا تھا۔

نیرو کی جس وقت دیوانہ وار درتوانہ کے حجرے میں پہنچا تو وہاں اس کی کوئی چیز نظر نہ آئی، مگر ایک موی چہرہ، جس پر نہایت ہی بدنما خط و خال بنے ہوئے تھے اور جسے اس نے اس دن واقعی درتوانہ کا حقیقی چہرہ سمجھ کر نفرت کا اظہار کیا تھا۔

ابجد کی ابتداء

ابجد سے لے کر ضظغ تک اہل عرب کے حروف ہجار کا مجموعہ ہے اور ان کی ترتیب ابجد کے لحاظ سے سوائے حروف علت کے وہی ہے جو عبرانی اور ارامی زبان میں پائی جاتی تھی اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل عرب نے حروف ہجا بناطیوں کے ذریعہ سے حاصل کئے تھے وہ چھ حرف جو عربی زبان کے لئے مخصوص ہیں انھیں سب سے آخیر میں رکھا گیا ہے۔ جس طرح اب موجودہ ترتیب کے ساتھ ان حروف سے اظہار اعداد کا کام لیا جاتا ہے بالکل اسی طرح آرامی زبان میں بھی رائج تھا۔

عربی کے موجودہ حروف ہجار کی ترتیب ابجد ہوز کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ مختلف ہے اور یہ ترتیب تحریر حروف کے لحاظ سے ہے یعنی جو جو حروف ایک طرح لکھے جاتے ہیں ان کو یکجا کر دیا اور یہ ترتیب بھی بہت قدیم ہے بعض نے مخارج کے لحاظ سے ان کو مرتب کیا ہے۔ چنانچہ کتاب العین میں الخلیل نے اور تہذیب میں الازہری نے مخارجی ترتیب کا لحاظ رکھ کر ان کو درج کیا ہے۔

خود اہل عرب کا بیان ہے کہ مدین کے چھ بادشاہوں نے عربی حروف ہجار کی ترتیب اپنے ناموں کے لحاظ سے مرتب کی تھی بعض کا بیان ہے کہ پہلے چھ الفاظ (ابجد سے لے کر قرشت تک) شیطانوں کے نام ہیں اور بعض انھیں ہفتہ کے دنوں کے نام بتاتے ہیں لیکن یہ تمام بیانات لغو ہیں حقیقت یہی ہے کہ عربوں نے حروف ہجا عبرانی اور ارامی زبان سے حاصل کئے اور چونکہ وہاں یہی ترتیب تھی جو ابجد ہوز وغیرہ میں پائی جاتی ہے اس لئے عربوں نے بھی اسے بجنسہ لے لیا بعد کو البتہ اس کی ترتیب میں بہ لحاظ اسلوب تحریر و مخارج کچھ فرق ہو گیا۔

نیاز فتحپوری

نیاز فتحپوری

اسلام کے متفرق فرقے اور فرقۂ اعتزال

اسلام میں بہتر فرقوں کے متعلق کوئی معتبر حدیث موجود نہیں ہے لیکن از رُوئے حقیقت اس وقت بہتر کیا سینکڑوں فرقے موجود ہیں جن میں راہ راست کا چلنے والا وہی کہلائے گا جو سب سے زیادہ پابندِ شریعت و سنتِ نبوی ہے اس مسئلہ پر تنقید کرنے کے لئے پہلے ایک شخص ثالث کی حیثیت پیدا کرنا چاہیے اور وہ دشوار ہے اس لئے میرے نزدیک اس جھگڑے میں پڑنا بیکار ہے، جو جس فرقہ میں ہو اس کو وہیں رہ کر غور کرنا چاہیے اور تفکر کامل کے بعد عقل سلیم جو فیصلہ کرے اس پر کاربند ہونا چاہیے۔

یوں تو تاریخی نقطۂ نظر سے اعتزال کی ابتدا صحابہ کے اخیر زمانہ سے ہوئی ہے لیکن اگر انصاف سے آپ پوچھتے ہیں تو مجھے کہنا پڑے گا کہ اس کی ابتدا عہدِ اسلام ہی میں پڑ چکی تھی، کیونکہ میرے نزدیک جس وقت سے اسلام اور مسایل اسلام میں چون و چرا کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا، اسی وقت سے اعتزال شروع ہو گیا تھا، پھر یہ سب کو معلوم ہے کہ عقاید و اعمال کے متعلق لوگوں کے درمیان اختلاف ابتدا ہی میں پیدا ہو گیا تھا، حضرت عائشہ اور صحابہ کے درمیان معراج جسمانی کے متعلق اختلاف پیدا ہونا سماع موتیٰ کے متعلق عبداللہ بن عمر اور دوسرے صحابہ میں اتفاق نہ ہونا، رونے سے مُردہ پر عذاب ہونے یا نہ ہونے کے متعلق ابوہریرہ اور حضرت عائشہ کے درمیان عدم اتفاق، اسی طرح اوقات نماز، ترکیب وضو، وغیرہ کے متعلق صحابہ کے درمیان اختلاف، یہ سب اس امر کا ثبوت ہے کہ مذہبیات میں عقل و نقل سے استدلال کا رواج ابتدا ہی میں ہو چلا تھا، اور حقیقتاً یہی بنیاد تھی اعتزال کی لیکن یوں تاریخ کے زاویۂ نگاہ سے سب سے پہلا اہم اختلاف جو سیاسیات کی بنا پر رُونما ہوا وہ شیعہ اور خوارج کا اختلاف تھا اور جس کی تفصیل غالباً آپ کو معلوم ہو گی۔ پھر چونکہ یہ سیاسی نزاع خلافت بنی اُمیّہ کے

عہد میں اور زیادہ قوی ہو گئی تھی اور ہر فریق اپنی طرف سے قرآن و حدیث ہی سے استدلال کرتا تھا اس لئے فرقہ بندیوں کو غلطی سے مذہبی تفریق قرار دے دیا گیا درانحالیکہ حقیقتاً وہ صرف سیاسی اختلاف تھا جس کو مذہبی رنگ میں پیش کیا جاتا تھا۔

جب عہد بنی امیہ میں مظالم زیادہ بڑھ گئے اور مسلمانوں کو قتل کیا جانے لگا تو ان کی طرف سے اس کی تاویل پیش کی گئی کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے۔ معبد جہنی ایک شخص نے جو بنو امیہ کا مخالف تھا، اس کی تردید کی اور کہا کہ انسان جتنی برائیاں کرتا ہے وہ خود اسی کا فعل ہوتی ہیں، خدا مجبور نہیں کرتا، جب عبد الملک بن مروان نے اس کو سنہ میں قتل کرا دیا تو غیلان دمشقی نے اس مسئلہ کو رواج دینا شروع کیا اور اسی کے ساتھ چند امور کا اور اضافہ کر دیا۔

اس کے بعد حسن بصری کے دو شاگردوں عمرو بن عبید اور واصل بن عطا نے خوارج کے اس مشہور مسئلہ سے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے، اختلاف کیا اور کہا کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ کافر ہوتا ہے نہ مسلمان رہتا ہے، حسن بصری نے جب یہ سنا تو بہت برہم ہوئے اور دونوں شاگردوں کو اپنے پاس سے جدا کر دیا اور اسی وقت سے یہ لوگ معتزلہ کہلائے جانے لگے۔ کیونکہ حسن بصری نے ان سے کہا تھا کہ "قد اعتزلتم عنی" (تم مجھ سے منحرف ہو گئے)

چونکہ عمرو بن عبید اور واصل بن عطا دونوں بڑے فاضل شخص تھے اس لئے انہوں نے مذہب اعتزال میں زیادہ نکتہ سنجی سے کام لیا اور خود حکومت بنی نے ان کا ساتھ دے کر اس فرقہ کو زیادہ مستحکم بنا دیا۔

بنو امیہ کے بعد بنو عباس کی حکومت قائم ہوئی اور چونکہ اس کے اکثر خلیفہ علوم و فنون کے سرپرست اور تحقیقات علمی کے شایق تھے اس لئے اس طبقہ کو اس عہد میں بھی قدرتاً ترقی کرنا چاہئے تھی کیونکہ اس وقت تمام اسلامی جماعتوں میں معتزلہ ہی کا گروہ ایسا تھا جو معقولات سے کام لیتا تھا، خلیفہ منصور چونکہ ایک آزاد خلیفہ تھا اور جمود و تشبیہ اشاعت مذہب کا مخالف تھا، اس لئے اس کے عہد میں علمی مناظروں کا بازار گرم ہو گیا

اور معتزلہ نے غیر مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کی طر ... خوب داد تحسین دی،
اس کے بعد خلیفہ مہدی کے زمانہ میں یہ آزادی رک گئی اور اس کا ... ہارون الرشید
... تک قائم رہا کیونکہ وہ فلسفیانہ دماغ نہ رکھتا تھا لیکن اس کے بعد جب مامون
کی حکومت شروع ہوئی تو پھر اعتزال بیدار ہوگیا اور اس کی ترقی انتہائی عروج کو پہنچ
گئی کیونکہ مامون خود معتزلی تھا اور مذہب کے باب میں نہایت آزاد۔

مامون کے بعد اتفاق سے معتصم اور معتصم کے بعد واثق کے ہاتھوں میں عنانِ حکومت
آئی اور یہ بھی دونوں معتزلی تھے، واثق کے بعد متوکل کا دور شروع ہوا جو ناموافق
زمانہ تھا لیکن گزشتہ خلفار کی سرپرستی میں اعتزال تمام ملک میں اور اس قدر کثرت سے
پھیل گیا تھا کہ وہ متوکل کے روکے نہ رک سکتا تھا، الغرض چوتھی صدی ہجری کے
اخیر تک معتزلہ کی قوت ایک حد تک قائم رہی اور پھر اشعری جماعت کا زور شروع ہوا
جو معتزلہ کی سخت مخالف تھی۔ ہر چند اشعری علمار معقولات کی مدد سے اعتزال کا رد تحریر
کرتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو خدمتیں اس سے قبل اعتزال انجام دے چکا تھا وہ
اپنی جگہ مستقل برکات کا حکم رکھتی تھیں اور اہل فہم سمجھتے تھے کہ اعتزال و اشعریت میں کیا
فرق ہے؟

اس طبقہ میں عمرو بن عبید، واصل بن عطا، غیلان دمشقی، ابو الہذیل، ابو علی جبائی،
نظام اور جاحظ ایسے لوگ گزر گئے ہیں، جن کا مثل پیدا نہیں ہوا اور جن کے احسانات
سے تاریخ اسلام کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی، یہ لوگ علاوہ علم وفضل کے اپنے اخلاق کے
لحاظ سے اس قدر بلند مرتبت تھے کہ مشکل سے عہد حاضر کے اشاعرہ میں کوئی ان کا مثل
نظر آسکتا ہے۔ بہ خصوص اپنی ذہنی آزادی اور صداقت و دیانت کی ایسی مثالیں چھوڑ
گئے ہیں کہ تاریخ اسلام ان پر جس قدر ناز کرے کم ہے۔

عہد بنی امیہ میں عمرو بن عبدالعزیز کا عہد خلافت ہے اور استبداد کا رنگ اس
قدر ترقی کر چکا ہے کہ باوجود عمرو بن عبدالعزیز کی صداقت پسندی کے کوئی شخص بنوامیہ
کے خلاف ایک لفظ منہ سے نہیں نکال سکتا لیکن معتزلی غیلان دمشقی جو توشہ خانہ شاہی

کی حفاظت پر مامور ہے، وہاں کی تمام چیزیں نکال نکال کر ذرہ ضائع کر رہا ہے اور کہتا جاتا ہے کہ آؤ ان کے مال پر جو خیانت کرتے تھے، آؤ ان کے مال پر جو ظالم تھے، غاصب تھے، لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ دین و ملت کے امام تھے، حالانکہ ان کے ظلم و جور سے مسلمان فاقہ میں مبتلا ہیں۔

جب ہشام کا عہد حکومت شروع ہوتا ہے تو وہ اسی غیلان کو گرفتار کرا کے ایک ایک کر کے اس کے اعضا کٹواتا ہے، لیکن وہ اپنی حق گوئی سے باز نہیں آتا یہاں تک کہ اخیر میں زبان کٹوا دی جاتی ہے اور وہ مر جاتا ہے۔

منصور عباسی کا عہد حکومت ہے، وہ منصور عباسی جس کی جلالت و سطوت سے ملک کانپ رہا ہے، عمرو بن عبید اس کو نصیحت کرتا ہے کہ "دولت و حکومت سخت بے وفا ہے، اگر اس میں وفا ہوتی تو تجھ تک نہ پہنچتی اس لئے آج کی رات اس دن سے ڈر جس کے بعد کوئی رات نہیں ہے" منصور پوچھتا ہے "کوئی حاجت ہو تو بیان کیجئے" وہ کہتا ہے کہ "میری خواہش یہی ہے کہ اب مجھے دوبارہ دربار میں آنے کی زحمت نہ دی جائے" کیا اس سے زیادہ روشن مثالیں اخلاق کی پاکیزگی کی اور پیش کی جاسکتی ہیں؟ اب فضل و کمال کو ملاحظہ کیجئے:۔

واصل بن عطا اپنے عہد کا بے مثل فصیح و بلیغ شخص تھا لیکن اس کی زبان سے حرف "ر" ادا نہ ہو سکتا تھا اور اکثر خاموش رہتا تھا مگر قادر الکلامی کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی خطبہ دینے کھڑا ہو جاتا تو گھنٹوں تقریر کرتا اور کوئی لفظ ایسا استعمال نہ کرتا کہ جس میں حرف "ر" آجائے۔

ابو الہذیل کے فضل و کمال کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ مامون الرشید نے اس کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا، کم سنی کے عالم میں اس کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ غیر مذہب کے بڑے بڑے فضلا اس کے سامنے زبان کھولتے ہوئے شرماتے تھے۔ ابو معن ثمامہ کا بیان ہے کہ مامون کے دربار میں ابو الہذیل ہمیشہ میرا نام لے کر پکارتا تھا، اور مامون مجھے میری کنیت سے مخاطب کیا کرتا تھا، یہ بات مجھے سخت ناگوار رہتی لیکن جب ایک

پروفیسر مظفر حسین ملا ٹھوی

امراؤ طارق کے افسانوں کا تجزیہ

گزشتہ پچاس سال میں اردو ادب میں افسانہ کو جو عروج ہوا ہے اس سے ہم اور آپ بخوبی واقف ہیں۔ افسانہ نگاروں کے بے شمار نام ہمارے پیش نظر ہیں۔ امراؤ طارق بھی پچھلے بیس یا پچیس سال سے افسانے لکھ رہے ہیں کراچی کے ادبی حلقے ان سے بخوبی واقف ہیں۔ عام مقبولیت کی وجہ سے نہ سہی کہنہ مشق افسانہ نگار ہونے کے سبب ان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ ان کا نام صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں لیا جائے۔ باوجود اس کے کہ اردو ادب میں افسانہ کو جو مقبولیت حاصل ہے اور افسانہ نگاری کے فن نے جس تیزی سے نقطۂ عروج حاصل کیا ہے اور افسانہ نگاروں کے لئے موجودہ معیار کے مطابق افسانے لکھنا نرگوئی سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ امراؤ طارق افسانہ کی جدید تکنیک اور معیار کو برقرار رکھنے میں قابل رشک حد تک کامیاب ہیں۔ قابل رشک کا فقرہ میں نے دانستہ استعمال کیا ہے اس لئے کہ ان کے ساتھ کے افسانہ نگار جنہیں میں جانتا ہوں قلم چھوڑ چکے ہیں۔ ان دنوں افسانہ نگاری کا میدان صنف نازک کے ہاتھوں میں ہے۔ اس اعتبار سے "بدن کا طواف" کے تعلق سے امراؤ مجھے اس صنفِ ادب کے مرد میدان معلوم ہوتے ہیں۔

افسانہ نگاری شاعری سے کہیں زیادہ نازک فن ہے شاعری میں قوت متخیلہ سے کام لیا جاتا ہے جب کہ افسانہ نگاری مشاہدہ اور تجربہ

کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ رومانی افسانوں کا دور مدت ہوئی ختم ہو چکا ہے خیالی افسانوں کی قدر مٹ چکی ہے۔ زندگی کی حقیقتوں کے ادراک کا دور ہے اس دور میں ادب کا تقاضہ زندگی کے حقائق کو منکشف کرنا ہے۔ جنّوں، پریوں اور شہزادوں کی رومانی داستانیں ہمارے لئے اب کوئی جاذبیت نہیں رکھتیں ہیں۔ آدمی اور آدمیت کی ساخت، ہیئت اور افادیت ہماری جدوجہد کا مرکز ہیں۔ آدمی ہنوز اپنے آپ سے غافل ہے۔ سچے اور مخلص آدمی کی نشاندہی مشکل ہے۔ جب تک ہم میں پرخلوص اور صادق اشخاص کی بہتات نہیں ہو گی ہماری سماجی اور معاشرتی زندگی فریب اور مکاری جیسے گناہوں سے آلودہ رہے گی ادب کا جدید تقاضہ یہ ہے کہ سچے آدمی کو تلاش کیا جائے۔ آدمی کی صفات و ذات سے آدمی کو آشنا کیا جائے اور اس کے اعمال کا آئینہ اسے دکھایا جائے تاکہ اس کا وجود جھنجھنا اٹھے، اس کے فکر و عمل میں انقلاب پیدا ہو اور وہ زندگی کے حقائق سے قریب تر ہونے میں ہمہ تن مصروف ہو جائے۔ امراؤ طارق نے اپنے افسانوں کا یہی مقصد بنایا ہے اور ان کے افسانے اسی محور کے گرد گھومتے ہیں

مجموعی حیثیت سے ادب کو معاشرتی اصلاح کیلئے موثر حربہ تصوّر کیا جاتا ہے لیکن افسانہ ادب کا ایک ایسا حصّہ ہے جو معاشرے سے براہ راست تعلق رکھتے ہوئے معاشرہ کی اصلاح میں موثر ترین حربہ کا کام انجام دیتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ادیب اور افسانہ نگار مصلح نہیں ہوتے ہیں۔ لیکن ادیب زندگی کی اعلیٰ قدروں سے بخوبی واقف ہوتا ہے اس کی نگارشات زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کی مسلسل ترغیب دیتی ہیں اس طرح ادیب زندگی کے معیوب پہلوؤں کی تردید اور احسن پہلوؤں کی ترویج کرتا ہے جو بالواسطہ معاشرہ کی اصلاح کا ضامن بنتا ہے۔

افسانہ میں زندگی کے چھوٹے چھوٹے اور معمولی واقعات

اس انداز سے پیش کیا جاتا ہے کہ یہ واقعات ماحول اور معاشرے کا بھرپور خاطر کر لیتے ہیں اور قاری کے ذہن پر انمٹ نقوش ابھار کر آدمی کو زندگی کے خوب و زشت سے آشنا کرتے ہیں۔ ہم زندگی کے معمولی واقعات کو نظر انداز کرنے کے عادی ہیں لیکن افسانہ نگار کی توجہ کا مرکز زندگی کے یہی معمولی واقعات ہوتے ہیں جسے وہ اپنے زور قلم اور فنکارانہ صلاحیتوں سے افسانہ کے قالب میں ڈھال دیتا ہے اور واقعات کو حیات جاودانی بخشتا ہے

ایک معیاری افسانہ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کوئی کردار غیر ضروری طور پر نہ شامل کیا گیا ہو، کوئی جملہ بلا مقصد نہ لکھا گیا ہو، واقعات کو اس تسلسل سے پیش کیا جائے کہ کہانی میں سسپنس قایم رہے اور قاری کی دلچسپی افسانہ کے آخری جملہ تک برقرار رہے اور جب وہ آخری جملہ ختم کرے تو حیرت زدہ رہ جائے مگر افسانہ کا مطلب محض قاری کو حیرت زدہ کرنا ہی نہیں ہے بلکہ اسے زندگی کی خوشبو اور خوبیوں سے آشنا کرنا بھی ہے۔ افسانے کے مختلف اقسام بتائے جاتے ہیں مثلاً نفسیاتی، سماجی اور معاشرتی، جنسیاتی، رومانی اور جاسوسی افسانے وغیرہ۔ ادب کا جدید تقاضہ یہ ہے کہ افسانہ کسی قسم کا بھی ہو اس میں زندگی کا کوئی واضح مقصد ہونا چاہیئے۔ مقصد تعمیری، اصلاحی، تنقیدی یا تفریحی ہوسکتا ہے۔ بلاشبہ تفریح زندگی کے لئے انتہائی ضروری ہے اور ادب کو تفریح کا ذریعہ بھی ہونا چاہیئے۔ افسانہ بھی تفریح کا ذریعہ ہے۔ لیکن وہ افسانہ مقصدی اعتبار سے بہت بلند ہے جس میں تفریح کا پہلو بھی ہو اور زندگی کی عکاسی بھی۔ امراؤ طارق نے اپنے افسانوں میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔ ان کے افسانے زیادہ تر سماجی اور معاشرتی ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں "اکتارا" اور "لمحے کی صلیب" علی الترتیب رومانی اور نفسیاتی افسانے ہیں۔ بقیہ افسانے جن کا ذکر آگے کیا جائیگا موضوع کے اعتبار سے متنوع ہیں اور ان میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑی ذہانت اور سنجیدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ اسلوب نگارش سادہ اور

پُراثر ہے۔

"اکتارا" میں امراؤ نے مرحوم مشرقی پاکستان کے ماہی گیروں کی زندگی کا خاکہ پیش کیا ہے۔ اسے میں نے رومانی اس لئے کہا ہے کہ اس افسانے کا پلاٹ ہمارے ذہن کے لئے قابل قبول نہیں ہے اور اس کی حیثیت تخیلاتی ہے حالانکہ افسانہ سو فیصد حقیقت پر مبنی ہے اس میں جو ماحول پیش کیا گیا ہے اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ چٹاگام کی نواحی بستیوں میں ایسا ہوتا ہے۔ یہ افسانہ ہر لحاظ سے مکمّل ہے۔ اس کا ہیرو افسانہ نگار خود ہے اور اس کی اپنی شخصیت بھی افسانہ میں جلوہ گر ہے۔ افسانہ نگار محبت اور خلوص کے جذبہ سے سرشار ہے۔ اس پر جنسی بھوک کا غلبہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ لذتیت کو زندگی کا مقصد سمجھتا ہے، خود کو اخلاقی پابندیوں میں جکڑا ہوا محسوس کرتا ہے اور محبّت کو ایک مقدّس جذبہ سمجھتا ہے۔ وہ عورت کو کھلونا سمجھ کر کھیلنے کا عادی نہیں ہے اور نہ ہی دوسروں کو اس کی اجازت دینا چاہتا ہے۔ امراؤ کی اپنی شخصیت ان کے افسانوں کے پردے میں "دیواریں" اور "مگر ایک شاخِ نہالِ غم" میں صاف نظر آتی ہے۔

"اکتارا" کے علاوہ ان افسانوں سے بھی افسانہ نگار کی مذکورہ خصوصیات کی توثیق ہوتی ہے۔ اکتارا میں ایک فوجی جوان کی انسانی ہمدردی اور محبّت کے جذبہ کا اظہار کیا گیا ہے۔ فوجیوں کے متعلق عام تاثر یہ ہے کہ فوجی سنگدل ہوتے ہیں اور لڑکیوں اور عورتوں کے معاملہ میں عموماً بھوکے شکاری کتّے کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف امراؤ نے فوجی جوان کو سنجیدہ اور نرم نازک دل رکھنے والا فرد ثابت کیا ہے، جو افسانہ میں انتہائی سادہ لوح نظر آتا ہے۔ اس افسانہ میں اگر افسانہ نگار اپنے بجائے کسی فوجی ساتھی کو ہیرو بناتا تو افسانے کی خوبی اور مقصدیت میں مزید اضافہ ہو جاتا اور افسانہ نگار کی شخصیت عام مروجہ اصطلاح میں "ایڈیٹ" اور "چغد" نظر نہیں آتی۔

"لمحے کی صلیب" ایک نفسیاتی افسانہ ہے جس میں سچے انسان کی تلاش و جستجو کو بڑے اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ امراؤ نے اس افسانے کے ذریعہ انسان کو ہر اس مقام پر ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے جسے مقام آدمیت کہا جاتا ہے۔ لیکن انسان کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ آخر بڑی تجسس کے بعد وہ انسان کو تلاش کر ہی لیتا ہے۔ وہ آدمی مل جاتا ہے جو مطلوب ہے لیکن وہ اپنے افراد خاندان میں اتنا مگن ہے کہ اس کے پاس دوسروں کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ تلاش کرنیوالے کے جذبات کا خون ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ مقصدِ حیات کو امراؤ نے بہت ہی دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔

امراؤ طارق کے افسانے زیادہ تر بیانیہ ہیں۔ بیانیہ افسانے حد درجہ احتیاط چاہتے ہیں اس قسم کے افسانے میں ہر لمحہ یہ خدشہ رہتا ہے کہ افسانہ نویس کہیں خطیب یا اپدیشک نہ بن جائے۔ امراؤ نے خود کو اس الزام سے بری رکھا ہے۔ افسانوں میں زیادہ تر کردار کے احساسات و جذبات کا اظہار کردار کی زبان سے ہی کیا گیا ہے جو عام انسان کے احساسات و جذبات سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ انداز تحریر اتنا موثر ہے کہ قاری خود کو افسانہ کا کردار سمجھنے لگتا ہے اور اسے ایسا لگتا ہے جیسے یہ واقعہ تو خود قاری کے ساتھ گزر چکا ہے۔ امراؤ کے کردار سے قاری کو حسرت نہیں نفرت پیدا ہوتی ہے۔ امراؤ کے افسانوں کی یہ خوبی امراؤ کو دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہوئی نظر آتی ہے جزیات نگاری اور اظہار کی سادگی اور سچائی سے ان کے افسانوں میں کہیں کہیں بیدی کے افسانوں کا لطف ملتا ہے۔ "بدن کا طواف" اور "لڑکی میرے گاؤں کی" ایسے افسانے ہیں جن میں جزیات نگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔

"بدن کا طواف" اور "لڑکی میرے گاؤں کی" موضوع کے اعتبار سے اچھوتے افسانے نہیں ہیں۔ ان موضوعات پر یقیناً افسانے

پیرا شرہے۔

"اکتارا" میں امراؤ نے مرحوم مشرقی پاکستان کے ماہی گیروں کی زندگی کا خاکہ پیش کیا ہے۔ اسے میں نے رومانی اس لئے کہا ہے کہ اس افسانے کا پلاٹ ہمارے ذہن کے لئے قابل قبول نہیں ہے اور اس کی حیثیت تخیلاتی ہے حالانکہ افسانہ سو فیصد حقیقت پر مبنی ہے اس میں جو ماحول پیش کیا گیا ہے اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ چٹاگام کی نواحی بستیوں میں ایسا ہوتا ہے۔ یہ افسانہ ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ اس کا ہیرو افسانہ نگار خود ہے اور اس کی اپنی شخصیت بھی افسانہ میں جلوہ گر ہے۔ افسانہ نگار محبت اور خلوص کے جذبہ سے سرشار ہے۔ اس پر جنسی بھوک کا غلبہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ لذتیت کو زندگی کا مقصد سمجھتا ہے، خود کو اخلاقی پابندیوں میں جکڑا ہوا محسوس کرتا ہے اور محبت کو ایک مقدس جذبہ سمجھتا ہے۔ وہ عورت کو کھلونا سمجھ کر کھیلنے کا عادی نہیں ہے اور نہ ہی دوسروں کو اس کی اجازت دینا چاہتا ہے۔ امراؤ کی اپنی شخصیت ان کے افسانوں کے پردے میں "دیواریں" اور "مگر ایک شاخ نہالِ غم" میں صاف نظر آتی ہے۔

"اکتارا" کے علاوہ ان افسانوں سے بھی افسانہ نگار کی مذکورہ خصوصیات کی توثیق ہوتی ہے۔ اکتارا میں ایک فوجی جوان کی انسانی ہمدردی اور محبت کے جذبہ کا اظہار کیا گیا ہے۔ فوجیوں کے متعلق عام تاثر یہ ہے کہ فوجی سنگدل ہوتے ہیں اور لڑکیوں اور عورتوں کے معاملہ میں عموماً بھوکے شکاری کتے کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف امراؤ نے فوجی جوان کو سنجیدہ اور نرم و نازک دل رکھنے والا فرد ثابت کیا ہے، جو افسانہ میں انتہائی سادہ لوح نظر آتا ہے۔ اس افسانہ میں اگر افسانہ نگار اپنے بجائے کسی فوجی ساتھی کو ہیرو بناتا تو افسانے کی خوبی اور مقصدیت میں مزید اضافہ ہو جاتا اور افسانہ نگار کی شخصیت عام مروجہ اصطلاح میں "ایڈیٹ" اور "چغد" نظر نہیں آتی۔

"لمحے کی صلیب" ایک نفسیاتی افسانہ ہے جس میں سچے انسان کی تلاش و جستجو کو بڑے اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ امراؤ نے اس افسانے کے ذریعہ انسان کو ہر اس مقام پر ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے جسے مقام آدمیت کہا جاتا ہے۔ لیکن انسان کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ آخر بڑی تجسس کے بعد وہ انسان کو تلاش کر ہی لیتا ہے۔ وہ آدمی مل جاتا ہے جو مطلوب ہے لیکن وہ اپنے افراد خاندان میں اتنا مگن ہے کہ اس کے پاس دوسروں کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ تلاش کرنیوالے کے جذبات کا خون ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ مقصدِ حیات کو امراؤ نے بہت ہی دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔

امراؤ طارق کے افسانے زیادہ تر بیانیہ ہیں۔ بیانیہ افسانے حد درجہ احتیاط چاہتے ہیں اس قسم کے افسانے میں ہر لحظہ یہ خدشہ رہتا ہے کہ افسانہ نویس کہیں خطیب یا اپدیشک نہ بن جائے۔ امراؤ نے خود کو اس الزام سے بری رکھا ہے۔ افسانوں میں زیادہ تر کردار کے احساسات و جذبات کا اظہار کردار کی زبان سے ہی کیا گیا ہے جو عام انسان کے احساسات و جذبات سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ انداز تحریر اتنا مؤثر ہے کہ قاری خود کو افسانہ کا کردار سمجھنے لگتا ہے اور اسے ایسا لگتا ہے جیسے یہ واقعہ تو خود قاری کے ساتھ گزر چکا ہے۔ امراؤ کے کردار سے قاری کو حسرت نہیں نفرت پیدا ہوتی ہے۔ امراؤ کے افسانوں کی یہ خوبی امراؤ کو دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتی ہوئی نظر آتی ہے جزیات نگاری اور اظہار کی سادگی اور سچائی سے ان کے افسانوں میں کہیں کہیں بیدی کے افسانوں کا لطف ملتا ہے۔ "بدن کا طواف" اور "لڑکی میرے گاؤں کی" ایسے افسانے ہیں جن میں جزیات نگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔

"بدن کا طواف" اور "لڑکی میرے گاؤں کی" موضوع کے اعتبار سے اچھوتے افسانے نہیں ہیں۔ ان موضوعات پہ یقیناً افسانے

لکھے گئے ہوں گے اس لئے کہ یہ واقعات نئے نہیں ہیں لیکن ان کا ٹریٹمنٹ
جس انداز سے کیا گیا ہے وہ یقیناً نیا اور قابلِ تعریف ہے۔ یہ دونوں افسانے
ہمارے سماج کی منھ بولتی تصویریں ہیں۔ ہم آئے دن ایسی باتیں سنتے اور
اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں۔ اِن افسانوں میں امراؤ کی فنکارانہ صلاحیتیں بہت
نمایاں ہیں۔ "بدن کا طواف" تقسیم ہند کے ساتھ تقسیم خاندان کا آئینہ دار ہے
اِنسانی رشتے تقسیم سے کس طرح متاثر ہوئے اور خاندان کن کن رسوا کن
حالات کا شکار ہوا۔ مہذب گھرانے کے لوگ کس طرح غیر مہذب بننے پر مجبور
ہوئے۔ معاشرہ میں گندگی کس طرح پھیلی۔ انسانی اقدار کیوں تبدیل ہوئے
ان ساری باتوں کا احاطہ امراؤ نے بڑے ہی فنکارانہ انداز میں کیا ہے اور میں
سمجھتا ہوں کہ اس موضوع پر اس سے بہتر افسانہ شاید ہی لکھا گیا ہو۔ منیرہ
لاوارث ہو کر پاکستان اپنی خالہ کے یہاں آتی ہے۔ اس کی خالہ مر جاتی ہے۔
اور اس کا خالہ زاد بھائی جو اس کا منگیتر بھی ہے گھر کی تنہائی میں اسے "ریپ"
کرتا ہے اور اس کے ساتھ بغیر نکاح ازدواجی زندگی بسر کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ
منیرہ کا منگیتر سلیم منیرہ کو دو ہزار روپیہ کے عوض ایک سیٹھ کے حوالے کر کے
اندھیرے میں گم ہو جاتا ہے۔ منیرہ گناہ آلود زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے
ایسے کردار ہمارے معاشرے میں ہمیشہ پائے گئے ہیں اور پائے جاتے رہیں گے۔

"لڑکی میرے گاؤں کی" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں عورت
کی تجارت کو پیش کیا گیا ہے۔ مجیدا چکلے کا دلال ہے۔ اس کی شادی اس کی
منگیتر بالی کے ساتھ محض اس لئے نہیں ہوتی ہے کہ وہ عورتوں کی دلالی کرتا ہے
لیکن بالی کے والدین بالی کی شادی مجیدا کے ایک دوست کے ساتھ کر دیتے ہیں۔
جو غیر ملک میں رہتا ہے حالانکہ وہ بھی غیر ملک میں عورتوں کی دلالی ہی کرتا ہے۔
پاکستان میں جب مجیدا کا دھندا ختم ہو جاتا ہے تو اسے اس کا دوست اپنے
پاس بلاتا ہے اور اس کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اس کے پاس شادی کر کے کسی

لڑکی کو لائے تاکہ اس کے دھندے میں اضافہ ہو مجیدا اور بالی دونوں ایک ساتھ ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہیں۔ جب مجیدا اپنے دوست کے پاس پہنچتا ہے تو اسے بہت جلد یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا دوست بالی کو بیوی کے روپ میں بیچ رہا ہے۔ بالی بکاؤ مال بن گئی ہے اور اس کے والدین یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کی بیٹی غیر ملک میں بڑے عیش میں زندگی گزار رہی ہے۔

مہاجرت کی زندگی کا ایک نمونہ امراؤ نے "دیواریں" میں پیش کیا ہے۔ اس میں بھی جو واقعہ افسانہ کی شکل اختیار کرتا ہے نیا نہیں ہے عموماً پیروں کی بدکاری کو افسانہ کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ لیکن امراؤ نے اس افسانے میں پیر صاحب کی سادہ لوحی اور مذہب کی سچی لگن کو پیش کیا ہے۔ پیر صاحب جذبۂ اخوت و انسانیت سے بیخود ہیں اور چاہتے ہیں کہ لوگ اللہ اور رسولؐ کے بتائے ہوئے راستوں پر چلیں، پیر صاحب دور اندیش بھی ہیں لیکن دوسروں کو فریب دینے کے بجائے خود فریب کھا جاتے ہیں ان کی لڑکی عابدہ انکے مرید کے ساتھ رات کی تاریکی میں گم ہو جاتی ہے۔ افسانہ میں جو ماحول پیش کیا گیا ہے اس کا تقاضہ یہ تھا کہ پیر صاحب اپنی اکلوتی جوان لڑکی جو بغیر ماں کے تنہا گھر میں رہتی تھی شادی کر دیتے۔ جوانی کے تقاضے اور ماحول کے اثرات تمام تقدس اور زہد و تقدس کو روند کر رکھ دیتے ہیں۔

"دراڑوں میں سانپ" میں امراؤ نے ایک سیاسی موضوع کو افسانہ کا محور بنایا ہے۔ جس میں ایک خاص طبقہ کی بے چارگی اور بے لسبی کا رونا رویا گیا ہے۔ یہ موضوع بھی بہت سے لوگوں کے لئے زندگی کا اہم ترین موضوع ہے۔ افسانہ میں خفیف سا طنز اس بات پر کیا گیا ہے کہ ملازمتوں اور اسکول کے داخلوں میں باپ دادا کی جائے پیدائش پوچھی جاتی ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جاتا ہے جس کا وہ خود کو مستحق نہیں سمجھتا ہے۔ ایک فارم پُر کرنے کے سلسلے میں بیٹا باپ سے اس کی جائے پیدائش پوچھتا ہے اور باپ جھلا کر کہتا ہے کہ "لکھ دو کہ میرا

باپ مرچکا ہے" اوراس نے اپنی جائے پیدائش نہیں بتائی ہے"۔ افسانہ اس فقرہ پر ختم ہوجاتا ہے۔ اس ایک فقرہ سے افسانہ کا تمام تاثر ذہن میں خود بخود پیدا ہوجاتا ہے۔ حیرت ہے کہ امراؤ نے اسے افسانہ بنادیا ہے۔

"بدن کا طواف" امراؤ طارق کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جو صرف دس بارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ تمام افسانے ہر اعتبار سے مکمل ہیں۔ ان افسانوں میں ندرت، لطافت اور زندگی کی حلاوت ملتی ہے۔ انہوں نے پلاٹ اور کردار کا انتخاب کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ ان کے افسانوں پر حقیقت نگاری کا گمان گزرتا ہے۔ ان کے افسانوں میں طبقاتی کشمکش اور غربت جیسے فرسودہ موضوعات نہیں ملتے ہیں اور نہ ہی زندگی سے عام بیزاری کا اظہار ملتا ہے۔ واقعات ایسے ہیں جو ہمارے سامنے روزانہ رونما ہوتے رہتے ہیں۔ افسانہ کی فکری سطح اتنی بلند نہیں ہے کہ ان سے ایک معمولی قاری محظوظ نہ ہوسکتا ہو اور نہ ہی افسانے اتنے پست ہیں کہ قابل اعتنا نہ ہوں۔ امراؤ کے افسانے میں جو بات پائی جاتی ہے وہ دل کی گہرائی میں اتر جاتی ہے لیکن بیان نہیں کی جاسکتی ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کا پختہ شعور ملتا ہے۔ حد درجہ سنجیدگی اور شائستگی پائی جاتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے دل میں اتر جاتے ہیں۔

امراؤ کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی میرے نزدیک ان کے افسانوں کا پلاٹ اور ان کی کردار نگاری ہے۔ انہوں نے افسانے کا پلاٹ زندگی کی مصروفیات سے منتخب کیا ہے۔ ایسی سماجی زندگی کی قدروں کو مرکزی خیال بنایا ہے جو وقتی ہونے کے ساتھ دائمی حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کے افسانوں میں جدید طرز زندگی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ ان دنوں جو افسانے لکھے جارہے ہیں ان میں افسانہ نگار کی حیثیت جانبدار معلوم ہوتی ہے۔ خواتین افسانہ نگار۔ عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش کھڑا کرنے کے لئے مہم جاری کررکھی ہے کہیں زندگی کے پرانے اقدار کو بیکار سمجھ کر مذاق اڑایا جارہا ہے۔ غرضیکہ اعتدا

پر مبنی افسانوں کی بے حد کمی ہے۔ عورت کی مظلومیت اور مردوں کی خود سری جدید افسانوں کی خاص موضوعات ہیں۔ ان موضوعات کے ٹریٹمنٹ میں افسانہ نگار مفروضات سے زیادہ کام لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ افسانے حقیقت پر قطعی مبنی نہیں ہوتے ہیں اور ان میں معاشرہ کی صحیح عکاسی نہیں ہوتی ہے۔ امراؤ کے افسانے ان برائیوں سے پاک ہیں۔ معاشرہ میں عورت اور مرد کے کردار کا حقیقت پسندانہ اور معتدل اظہار ہی امراؤ کے افسانوں کو مؤثر بناتے ہیں۔ امراؤ کی طبیعت میں سنجیدگی اور جذبات میں ٹھہراؤ ہے۔ وہ جس موضوع پر سوچتے ہیں اس کے لئے غیر ملکی افسانہ نگاروں کا اتباع نہیں کرتے ہیں۔ اور نہ ہی کرداروں کو بلا وجہ جدیدیت سے ملوث کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا کوئی بھی کردار سماج سے باغی، مذہب سے بیزار اور روایت سے منحرف نظر نہیں آتا ہے بلکہ ہر کردار اپنی جگہ حالات سے سمجھوتہ کرنے کی طرف مائل نظر آتا ہے۔ امراؤ یہ سمجھوتہ سماج کی مروجہ روایت اور عقائد کی رو سے کرنا چاہتے ہیں۔

اسی طرح کسی مالدار شخص کی خود سر اکلوتی بیٹی یا مجرد عیاش اور اوباش اکلوتے بیٹے کے کردار کو امراؤ نے اپنے افسانوں میں جگہ نہیں دی ہے۔ زمیندارانہ، جاگیردارانہ اور الٹرا ماڈرن سوسائٹی امراؤ کی فکر کا مرکز نہیں ہیں۔ امراؤ کا تعلق متوسط طبقے سے ہے اور وہ متوسط طبقہ کی زندگی کو افسانے میں پیش کرتے ہیں اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ جو کچھ ان کے ارد گرد ہو رہا ہے اسے تمام تر اثرات کے ساتھ افسانے میں سمو دیا جائے۔ میرے خیال میں امراؤ طارق اپنی اس کوشش میں بہت کامیاب ہیں۔ ان کی زندگی اور ان کے فکر میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ امراؤ بڑے سے بڑے واقعات کو افسانہ کرنے میں کسی قسم کے جذبات کی شدت کا مظاہرہ نہیں کرتے ہیں۔ نظریاتی طور پر بھی اُن میں

ایک ٹھہراؤ ہے۔ ان کو پرانی تہذیب اور رسم و رواج بہت عزیز ہیں۔ وہ انہیں روند کر نئی تہذیب کے ڈھنڈورچی نہیں بننا چاہتے ہیں۔ وہ رسماً اور فیشن کے طور پر اشتراکیت اور دہریت کا پرچار اپنے افسانے میں نہیں کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ امراؤ زندگی کے جدید تقاضوں سے واقف نہیں ہیں۔ بخوبی واقف ہیں۔ لیکن وہ جدید تقاضوں میں استحکام نہیں پاتے ہیں اور اسے محض وقتی اور جذباتی تقاضہ تصور کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ امراؤ زندگی کے ارتقا کے منکر نہیں ہیں بلکہ زندگی کو دائمی اقدار کے ساتھ روبہ ترقی دیکھنا چاہتے ہیں ا صحتمند ادب کا تقاضا یہی ہے۔ امراؤ صحتمند ادب سے بخوبی واقف ہیں اور ا سے امید ہے کہ اردو ادب میں افسانہ کی صنف میں منشی پریم چند کے اسلو، نگارش کو زندہ رکھنے اور اس میں تازگی پیدا کرنے میں آئندہ نسل کی رہنما کریں گے۔